15

Comp

خطوطِ رموزی

(اپنے ظریفانہ رنگ میں)

مصنفہ

ضیاء الملک ملا رموزی فاضل الٰہیات ایم آر اے ایس لندن

عتیق الرحمٰن ذکر الرحمٰن تاجران کتب چوک ڈاکخانہ بھوپال۔

قیمت فی جلد

(بار اول ایک ہزار جلد)

فہرست "خطوط رموزی"

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	مقدمہ	۵	۱۲	خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار دیہاتی (انبالہ)	۱۱۱
۲	خط بنام ایڈیٹر صاحب اخبار خیام لاہور	۱۵	۱۳	" " صدائے نسواں دہلی	۱۲۳
۳	" " "	۲۴	۱۴	" " مستورات کانپور	۱۳۱
۴	" " "	۳۲	۱۵	" " "	۱۳۹
۵	" " "	۴۱	۱۶	" " مسیحا رامپور	۱۴۴
۶	" " "نگارستان" دہلی	۵۰	۱۷	" " خیام لاہور	۱۵۰
۷	" " عصر جدید کلکتہ	۵۶	۱۸	" " ارمغان دہلی	۱۵۸
۸	" " صبح دکن حیدرآباد	۶۷	۱۹	" " " "	۱۶۵
۹	" " ہمدرد صحت دہلی	۸۲	۲۰	" " ادیب پشاور	۱۷۱
۱۰	" " کائنات لکھنؤ	۹۶	۲۱	" " الجمعیۃ دہلی	۱۸۴
۱۱	" " صدائے نسواں دہلی	۱۰۵	۲۲	" " الخلیل دہلی	۱۸۹

مقدمہ

(از حضرت مولوی لیاقت حسین صاحب، ایم اے، ایل ایل بی مولوی فاضل، (پونہ)

مجھے فخر ہے کہ ہندوستان کے شہرۂ آفاق ادیب ملّا رموزی کے تیسرے اسلوب نگارش پر کچھ لکھنے کا مجھے موقع مل رہا ہے،

میں نے کئی بار لکھا ہے اور اب پھر لکھتا ہوں کہ جو لوگ اپنی کم علمی کیوجہ سے ملّا رموزی کو صرف ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، وہ خود اپنی علمی بے بسی کا ثبوت دیتے ہیں، جبکہ امر حقیقت یہ ہے کہ ملّا رموزی پہلے محقق ہیں، فلسفی ہیں، مدبّر ہیں، اور بعد میں ادیب و انشا پرداز، اور یہ وہ علمی دولت ہے، جو ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہوتی، اور علم و فضیلت ذہن کی یہی وہ نادر و نایاب دولت ہے جس کے اثر سے ملّا رموزی اپنی تحریر و تقریر میں جو کہتے ہیں وہ حکیمانہ، اور جو سناتے ہیں وہ اچھوتا۔

اُن کا پہلا طرزِ تحریر "گلابی اُردو" اسی لئے شہرت دوام کا ذریعہ ہوا کہ گویہ طرز انشأ

کسی وقت میں دُوسرے اصحاب علم کا طریق خطاب و کلام تھا، مگر بے حد خشک و بے اثر، لیکن ملّا رموزی نے اس طرز کو جب اپنایا تو اس میں عہد جدید کی سیاست اور بین الاقوامی مسایل کے جن ناقابلِ حل عقدوں کو حل کر کے دکھایا، وہ عوام و خواص کی حیرت، مقبولیت، فایدہ اور دلچسپی سے گذر کر بجائے خود ایک اسلوب انشاء کی جگہ پا گیا، کیوں ؟

صرف اس لئے کہ ہوشمند اور وسیع العلم ملّا رموزی نے اس طرز انشاء میں وہ چیزیں پیش کیں جو ہر شخص چاہتا تھا، مگر دُوسروں کے کلام میں نہیں ملتی تھیں اور لاکھوں انسانوں کی دل کی کہدینا نفسیات اور فلسفۂ اجتماع کے ایک بہترین ماہر ہی کا کام ہے، اسی لئے ملّا رموزی اور اُن کے ساتھیوں میں یہ فرق آج تک موجود ہے کہ دُوسرے جو کچھ لکھتے ہیں وہ وہ لکھتے ہیں جو اُن کے جی میں آتا ہے، اور ملّا رموزی وہ لکھتے ہیں جو دُوسروں کے جی میں آتا ہے، مگر وہ اس کو اس سلیقہ سے نہیں کہہ سکتے جس سلیقہ سے ملّا رموزی کہہ گذرتے ہیں، اور اسی لئے اُن کی تحریر پڑھنے والے یہ کہنے پر مجبور ملتے ہیں کہ ع

تُو نے وہ کہدی کہ گویا یہ بھی میرے جی میں تھی

اور اس نوع کی تحریریں لکھنا اصل میں ملّا رموزی کے مافوق الفطرت فلسفی او

محقق و مدبّر ہونے کا صدقہ ہے۔

عہد جہل و غلامی کی فطرت کُند ذہنی، بلادت، بے حسی، بے علمی، اور سطحی امور سے دلچسپی ہے اور تقلید و نقل، یہی وجہ ہے کہ اُردو میں اخبار اور رسالے اور شعر و افسانہ کو جو بھی اختیار کرتا ہے وہ یورپ ہی کے اخبار اور رسالے اور شعر و افسانہ کے رنگ میں ڈھالتا ہے، یعنی اصحاب فکر و قلم تو ہیں مگر سب کے سب نقّال، نہیں ہے تو کوئی موجد، یہ وہ کمی ہے بلکہ بے بسی اور بے مائیگی جس کے بل پر اُردو کی آنے والی نسلوں کو یورپ طعنہ دے سکتا ہے کہ تمہاری اُردو میں جو کچھ ہے وہ ایران و عرب کا ہے یا پھر یورپ کا، بدقسمتی سے ہمارے تصنیفی ادارے بھی بیٹھے تو نقل علوم و افکار کے نام سے یورپ ہی کے محققین و اصحاب فکر کے پیدا کردہ نتائج کے تراجم تک رہ گئے اور بس، لیکن مصنفین اُردو میں ایسے کتنے ہیں جنہوں نے یورپی محققین کے حوالے بغیر خود اپنی تحریر کو ہندوستانی حالات و حقائق کے مطابق کوئی ایجادی تحریر بنا کر پیش کیا ہو؟

بے شبہ اُردو میں بعض اصحاب طرزِ خصوصی اور موجد بھی ہیں، لیکن اُن کی قلّت اس درجہ یاس انگیز ہے کہ بیان سے شرم آتی ہے، پس اُردو کے

ایسے ویران اور بے مایہ میدان میں قدم دھرتے ہی ملّا رموزی جو آفتاب شہرت ہو گئے اُس کا راز یہی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں لاکھوں ہندوستانیوں کی دل کی کہتے ہیں، اور اتنے جدید و لذیذ انداز سے کہتے ہیں جو دوسرے نہیں کہہ سکتے،

بالکل یہی کمال اُن کے اس "طرز خطوطی" میں موجود ہے، یعنی اُردو میں باہمی خط و کتابت کے جو آداب و ضوابط پچھلے بزرگ وضع فرما گئے تھے وہ آج کی نسل کے لئے مذاق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، لیکن ملّا رموزی نے اُن ہی آداب و ضوابط کو استعمال کیا لیکن اس کمال جدت و ندرت اور اس درجہ حکیمانہ گُر بتاتے ہوئے کہ اُونچے سے اُونچے درجہ کے اخباروں اور رسالوں نے اُن کے ان خطوط کو بہ معاوضہ قبول کیا۔

سیاست حاضرہ، بین الاقوامی مسائل، قومی ضروریات، مذہبی امور و ضوابط کے جو دریا دریا ذخائر ملّا رموزی کے مضامین میں ملتے ہیں، اُن سے انکار کی جرأت تو اُن کے مخالفین میں بھی نہیں، لیکن ایک نئے اور اچھوتے سلیقے سے ان باتوں کو مضمون یا خط کے رنگ میں ڈھال دینا ہی وہ قدرت قلم ہے جس کی طاقت سے ملّا رموزی عوام و خواص کے دلوں پر حکومت

کرتے ہیں۔

مثلاً آئیے اور پرانے طرز خط نویسی کے ایک لفظ "دیگر احوال" کو لیجئے۔ جس کے سہارے ملّا رموزی ہندوستان سے یورپ اور یورپ سے امریکہ، افریقہ اور سارے ایشیا میں گھوم آتے ہیں، اور وہ کچھ کہہ جاتے ہیں جو اِن تمام براعظموں میں ہو رہا ہے اور پھر دیکھئے تو "دیگر احوال" پر موجود ہیں۔

وہ دن گئے جو کسی مسئلہ کو ذہن نشین کرانے کیلئے لمبی لمبی منطقی تمہیدیں ادق اور ناقابل فہم ضوابط انشاء میں ڈھال کر ایک سلسلہ کلام شروع کیا جاتا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی ادق اور علمی کتابیں اور مضامین آج تک سینکڑوں شرحوں اور تفصیلوں ہی کی محتاج پڑی ہوئی ہیں، اور انسان اُن کے فوائد سے محروم ہے، البتہ آج اُسی تحریر کو قبول عام کا رُتبہ و امتیاز ملتا ہے جو عام انسانوں کے فہم و ذہن کے موافق ہو، خواہ وہ کسی ضابطہ انشاء سے پیش کی جائے،

پس اس عقلی و فطری قاعدہ سے ملّا رموزی اُردو میں سب سے پہلے صاحب قلم ہیں، جنہوں نے اپنے مضامین میں نہ کبھی تمہید و افتتاحیہ کی کوشش کی، اور نہ کبھی مقرر کردہ عنوان کے تابع رہے، بلکہ ایک عنوان کے

تحت وہ کام کی ایسی باتیں بھی کہہ گئے جو عنوان کی مطابقت سے زیادہ ضروری اور مفید تھیں، مثلاً ستمبر ۱۹۳۲ء میں اپنے دوست محمد احمد خانصاحب ایڈیٹر رسالہ "مسلمہ" جالندھر کو ان کی بہن کے انتقال پر تعزیت کا خط لکھتے ہیں، ظاہر ہے کہ اصولاً اس خط میں صرف عزاء و ہمدردی کے خیالات ہونا چاہیئے تھے، مگر وہ اس خط میں حصول تاج و تخت کے گر بھی بتاتے ہیں، امتحان میں کامیابی کا ذریعہ بھی بتاتے ہیں، امیروں کو غریبوں کیساتھ حُسنِ سلوک سے پیش آنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں، والدین کو تربیت اولاد کے طریقے بھی سکھلاتے ہیں، نماز روزہ کی پابندی کے فوائد بھی بتاتے ہیں۔ اور تعزیت نامہ کی عبارت بھی لکھتے جاتے ہیں۔

اب فرمائیے کہ کم علم اور بے عمل قوم کو ایسے مضامین کی ضرورت ہے، یا وہ مضامین جو ادق الفاظ و اصطلاحات اور ناقابل فہم آداب و ضوابط انشاء کے تحت لکھے جاتے ہیں؟ ممکن ہے کہ ادق مضامین کی ضرورت بھی ہو، لیکن ہو۔

ملّا رموزی کے تمام اسالیب انشاء کی کامیابی کا راز اصل میں ملّا رموزی کی خداداد قوتِ استقلال و استقامت عمل ہے، یعنی وہ جس کام کو شروع

کرتے ہیں اس کو اس کی حد تک پہنچانے میں وہ اس درجہ ثابت قدم، باہمت پُر جوش، اور لگاتار کوشش کرنے والے ہیں کہ اس راہ میں اُن کو پہاڑوں کی بلندی، طوفانوں کی دہشت اور بجلی اور آندھی کی ہولناک رکاوٹ بھی، نہیں روک سکتی، وہ خوف وخطر، اندیشے اور دشمن کو کبھی خاطر ہی میں نہیں لاتے، جو لکھتے ہیں لکھتے ہی چلے جاتے ہیں، جو کہتے ہیں کہتے ہی رہتے ہیں، خواہ مخالف کتنی ہی مخالفتیں کرے اور خطرات کتنا ہی ڈرائیں، بلکہ خود اُن کا مقولہ ہے کہ:-

"خطرات کے پیدا ہونے ہی سے مقابلہ کی ہمت بھی پیدا ہوتی ہے جس کو عوام نہیں سمجھتے"

اسی لئے اُن کا ہر اسلوبِ نگارش کامیاب اور ایجادی ہو کر رہا، اور آج مخالفوں نے بھی اُن کو اُردو کا صاحب طرز امام تسلیم کر ہی لیا،

ملّا رموزی کے اسالیب انشاء میں عوام وخواص کے لئے جو فریفتگی اور دلدادگی ہے اُس کا بڑا اہم جزء ملّا رموزی کا وہ دماغ ہے، جس کو اگر "بحر العلوم" کہیں تو غلط نہیں، یعنی غضب ہے کہ انسانوں کی ضروریات کے اتنے گوشے اُن کے سامنے کھُلے رہتے ہیں گویا وہ دن رات اِن ہی

حالات کے مطالعہ میں منہمک رہتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ یہ اُن کے احاطۂ علم اور بصیرت کا وہ مافوق الفطرت ملکہ ہے جو عین مضمون نگاری کے وقت مستعد ہوتا ہے، لیکن جس عنوان کے لئے مستعد ہوتا ہے اُس کا کوئی گوشہ نہیں جانے دیتا۔

ملّا رموزی اب شاعر بھی ہو چکے ہیں اور بعض خالص فلسفہ کی کتابوں کے مصنّف بھی، لیکن اُن کے تمام ذخایرِ تحریر کی جان اُن کا سلیقۂ بیان، اُسکی رنگینی، دلکشی، ندرت وجدّت اور طاقت ہے،

یہاں اُن کے کمالات میں سے ایک اچھوتا کمال ملاحظہ ہو، یعنی عام اصحابِ قلم جس مضمون کو خاص اور آخری قابلیت سے لکھتے ہیں، اس کے لئے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "قلم توڑ دیا" اور "حق ادا کر دیا" لیکن ملّا رموزی جو کچھ لکھتے ہیں وہ ہمیشہ تھوڑا لکھتے ہیں، یعنی جتنا اور جس طرح وہ لکھ چکے ہیں، اس سے سوا لکھنے اور اس سے بہتر کہنے پر وہ بعد میں بھی مستعد ملتے ہیں، اور اُن کے اس کمال کا اندازہ صرف اُن کی بہاروں سے سجی ہوئی اور معلومات سے مزیّن و منوّر گفتگو ہی سے ہو سکتا ہے اور میں نے اسی لئے اُن کے اندازِ کلام کی جدّت وندرت کیساتھ "طاقت" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے،

یعنی جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو اُس وقت وہ اپنے مضمون سے کہیں زیادہ دلچسپ، ذی علم، بالغ نظر اور شیر نظر آتے ہیں، وہ گفتگو یا بحث میں کسی مسئلہ کو منوانے کے لئے جو بہار بہار انداز کلام شروع کرتے ہیں، اس میں جگہ جگہ وہ بپھرے ہوئے اور غضبناک شیر کا انداز اس حُسن سے پیدا کرتے ہیں کہ سامع اور مخالف کو تسلیم خم کئے بغیر چارہ نہیں رہتا، مگر اس طرح کا سامع خود رنگین ہوجاتا ہے، اور یہی انداز اُن کے مضامین میں بھی موجود ہے کہ بہار بہار ظرافت کے ساتھ ساتھ جب وہ کسی حقیقت کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو تحریر کے تمام خطرات سے یکلخت بے پروا اور نڈر ہوجاتے ہیں، اور یہی انداز کلام اُن کی تقریروں میں بیشمار افراد دیکھ چکے ہیں، چنانچہ ان کی تقریر کے بیچ میں ہزاروں انسان جس درلعبہ باغ و بہار بن جاتے ہیں اسی طرح مسائل میں اُن کی شدت بیان سے سہم بھی جاتے ہیں، مگر ملا رموزی کی گفتگو کی اس بہار کا آندازہ صرف اُن ہی کو ہے جو اُن کی جادو میں ڈوبی ہوئی گفتگو سُن سکے ہیں، مضامین سے کامل اندازہ ناممکن ہے،

ملا رموزی کی قدرت کلام و بیان میں اُن کی اس قدرت کا سب کو

اقرار ہے، کہ وہ عہد جدید کے تمام مضامین نگار حضرات میں درجۂ اوّل کے فصاحت نگار اور غایت درجہ کی سلاست کے مالک ہیں، حد ہے کہ آج اُن کی کتابوں اور مضامین سے بچّے، نوجوان اور بُوڑھے یکساں فائدہ اُٹھا رہے ہیں، یہ وہ ملکۂ خصوصی ہے جو صرف فطرت ہی سے کسی کو عطا ہوتا ہے۔ اور یہ خطوط تو اس طرز خصوصی کی جان ہیں، ان خطوط کی سطر سطر سے جو بے تکلّف انداز کلام نمایاں ہے، مسائل و نصائح میں جو سادگی، برجستگی، سلاست اور فطری بے ساختگی موجود ہے، کون ہے جو اس سے لطف اندوز نہ ہوگا؟ ع

"بریں شرح برافشاند فلک عقد ثریّا را"

لیاقت حسین

خطوطِ رموزی

(۱)

ایڈیٹر "خیام" لاہور کے نام

محترم مدیر "خیام"!

اگر کسی مرد کو زن مرید کے عوض "زن پسندی" کا ذوقِ سلیم عطا ہو اور اُوپر سے بیوی بھی کتب بینی کا مذاق بلند رکھتی ہو، تو ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اس کی ڈاک بڑی مبارک ڈاک سمجھی جائیگی، اس لئے میں نے تیزی سے آپ کے "جنگ نمبر" کو بنفس خود ہی الف سے ی تک پڑھ لیا، اس نمبر سے مجھے قدرتی طور پر لگاؤ ہے یعنی نجوم کے حساب سے میں "سنگھ راسی" ہوں، یعنی شیر کے خصائل

کا مالک۔ اس لئے جنگ وجدل، قتل وقتال، بمباری، تارپیڈو، مقناطیسی سُرنگ، مشین گن، "ہاؤٹسزر گن" ۵۷ میل دُور مار کرنیوالی توپ، شعاع مرگ، زہریلی گیس، بندوق، سنگین، تلوار، چاقو، محنت، کوہ وقار استقلال، اور بہادر بیوی گویا میری زندگی کے بہترین مرغوبات ہیں اور خدا کی شان کہ ہندوستان میں یہی چیزیں ناپید ہیں، یعنی ندارد، اس لئے "جنگ نمبر" کے اعلان ہی سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا آجکل میں خود فرانس کی مجینو لائن پر ہٹلر کا مقابلہ کر رہا ہوں، اور جیسے ہی "خیام" کا "جنگ نمبر" شائع ہوگا، میں اسے شکست دے دُونگا، وہ تو کہئے بیوی نمبر ۳ کی محبت اور قانون کا ڈر تھا، ورنہ اس نمبر کے ہجر و فراق میں میرا افیون کھا کر جان دے دینا زیادہ مشکل نہ تھا،

الحمدللہ کہ یہ نمبر مل گیا اور تمام ڈاکخانوں کی دست وبُرد، بھُول چُوک، اور گھر والوں کے تڑا لینے، چمکا لینے، پار کردینے، غائب کردینے، دبا لینے اور چھُپا لینے سے بھی محفوظ رہا، ورنہ میرے اور میری چھوٹی بیوی کے مر جانے میں تو کسر ہی نہ تھی، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو جو عشق ریڈیو، سنیما اور پارک کی

تفریحات سے ہے وہ اُردو کے اخباروں اور رسالوں سے کہاں، اس لئے میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ دُنیا بھر میں صرف میں اور میری چھوٹی بیوی ہی اُردو کے اخبارات اور رسالے پڑھتی ہے، اسی لئے قدرت نے اسے میرے لئے اور مجھے اس کے لئے پیدا کیا اور آپ کو ہم دونوں کے لئے عمدہ عمدہ نمبر تیار کرنے کے لئے ــــ!!

دیگر احوال یہ ہے کہ اس نمبر کے پہلے ورق پر توپ اور تلوار کی تصویر دینے کے عوض آپ نے جو عورت ذات کی تصویر دیدی تو میں آپ کے "نفسیت دان" ہونے کا قایل ہوگیا، جی ہاں ممکن تھا کہ ورق اوّل پر توپ اور تلوار دیکھ کر کالج کے بعض "ریشم زادے" بھاگ جاتے، یا غش کی سی کیفیت طاری ہو جاتی، جیسا کہ اُن کے جسم کی فینسی آرائیش اور نزاکت سے پتہ چلتا ہے، اس تصویر سے میں نے دُوسرے معنی یہ لئے گویا آپ ہندوستان کے نوجوانوں سے "تصویراً" کہہ رہے ہیں کہ اگر تم نے ہٹلر کی انسانیت سوز جنگ میں، ہٹلریت کی تباہی میں حصہ نہ لیا تو ممکن ہے کہ ہندوستان کے بہادر گھرانوں کی عورتیں ہٹلریت کی تباہی کے لئے نکل آئیں! مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں تعلیم تو خیر جو ہے سو ہے، لیکن ایسے نازک علمی اشارے کنائے

سمجھنے والے کہاں ؟

الحاصل آپ نے تو اپنا فرض ادا کردیا، اس لئے عرض ہے کہ "جنگ نمبر" ملا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا، جنگ نمبر کے صفحہ اوّل عرف سرورق پر رنگ و جمال اور عورت کے شباب و ادا کا جو منظر آپ نے پیش کیا ہے الحق کہ غضب کا عشق خیز و عشق انگیز و عشق افروز و عشق آرا ہے، مگر مصیبت یہ ہے کہ بڑے مولوی صاحب نے عشق کو بھی مکروہ تحریمی قرار دیا ہے اور اسی لئے بے عشق و محبت شادی بیاہ کے گھرانے افیون کھا کھا کر دھڑا دھڑ خودکشی کر رہے ہیں، مگر مولوی صاحب کو ذرا پروا نہیں اور یہ اس لئے کہ خود انہوں نے کبھی عورت کے دل کی نزاکتوں اور اس کی نگاہ و ادا کے عقل افروز تیر کھائے ہوں تو وہ جانتے کہ عشق و محبت سے حاصل ہونے والی عورت اور عشق کرنے والا مرد ہی فطرت کا وہ صحیح جوڑا ہوتا ہے جو نسل و عقل غرض زمانہ بھر میں ایک مفید اور حیرت خیز انقلاب برپا کر سکتا ہے اور یہ رسم و رواج کے مارے ہوئے میاں بیوی تو ایک طرح کے "پالتو جانور" یا "گھریلو مواشی" ہوتے ہیں، جو کھاتے پیتے اور دودھ دیتے ہیں، مگر انسانیت کے لئے تو وہی دماغ کام کرتے ہیں جو عشق و محبت کی طاقت سے میاں بیوی بنے ہوں،

مگر خدا جانے عشق و محبت کی شادیوں کے لئے بھی گورنمنٹ کو کوئی کارخانہ کھولنا پڑیگا، یا ہم کو آپکو چندہ کے ذریعہ اس کام کو چلانا پڑیگا، کیونکہ یہ پُرانی رسم والے نواب روپیہ لے کر لڑکیوں کی قبریں بنائے جارہے ہیں، اسی طرح ان کے قبضہ کے شرمیلی لڑکے ہیں جو غریب بے پسند کی بیویوں کے گلے سے باندھے جارہے ہیں، پھر سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ بڑے مولوی صاحب کے رنگ کے جتنے ہیں چار بیویوں تک تو اجازت دینے میں بڑے حاکم بلکہ صوبہ بھر کے گورنر جنرل معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن سے کہدوں کہ ایک ہی بیوی عشق کر کے حاصل کروں تو بس پھر مین ہُوں اور اُن کی بلغم بلی ہوئی گالیاں

الحاصل "جنگ نمبر" سے یہ تو ثابت کیا جاسکتا تھا کہ جنگِ جرمنی کی غرض صرف لمبی چوڑی زمین حاصل کرنا ہے، چاہے انسان کی تہذیب و تمدّن اور مکانات پیوند زمین ہو جائیں۔

ثابت کیا جاسکتا تھا کہ موجودہ جنگ کے تفصیلی اسباب یہ ہیں اور اس جنگ کو روکنے کے لئے برطانی مدبّرین اور فرانسیسی وزراء اور ملّا رموزی وغیرہ نے یہ کیا،

ثابت کیا جاسکتا تھا کہ جنگِ حاضرہ میں اگر ہندوستان نے حصّہ نہ لیا،

تو ہندوستان کے امن وسکون اور اس کی موجودہ ترقی کو بھی شدید نقصان سے سابقہ پڑیگا۔

ثابت کر دیا گیا کہ "تارپیڈو" اسکو کہتے ہیں اور "سمندر پھاڑ بم" یہ ہیں، ثابت کر دیا گیا کہ بحیرۂ روم کو اگر آپ لوگ کوئی بہت بڑا تالاب سمجھے ہوئے تھے، تو یہ غلط تھا، بلکہ اصل بحیرۂ روم اور اس کے سیاسی و جغرافیائی اور بین الاقوامی جھگڑوں کے اسباب یہ ہیں،

مگر جنگ نمبر میں یہ ثابت کرنا وزیر جنگ کے بس کا بھی نہیں تھا، کہ جنگ کے عین وسط میں عشق وعاشقی کے معاملات بھی طے ہو جاتے ہیں، مگر آپ نے غضب کیا کہ اس جنگ نمبر میں یہ عقدہ بھی حل کر کے رکھدیا کہ عشق کو جنگ پر بھی غلبہ حاصل ہے، اور ایک حسینہ یا دوشیزہ عظیم الشان جنگی انسانوں کے دلوں کو اس طرح غلام بنا کر جنگ کا پانسہ بدل دیتی ہے، یا خود جنگ کرتی ہے، یا جاسوسی کے ذریعہ بڑی سے بڑی جنگ کو روک دیتی ہے، یا دشمن کے راز اپنی حکومت کو پہنچا دیتی ہے، یعنی عورت کی مقدرت اور اسکی جادو اثر طاقت کا یہ وہ حصہ ہے جس کو جنگ نمبر کی اگر جان کہا جائے تو بڑے مولوی صاحب کا کیا نقصان ؟ بس آپ کے اس عقدہ کو حل کر دینے کے بعد میرے ذمہ یہ

رہ گیا کہ اب میں اُن اسباب پر غور کروں اور دُنیا کو آگاہ کروں کہ دُنیا کی حسین سے حسین دوشیزہ شباب و جمال کی جیتی جاگتی پری اور ناز و غمزہ کی کوئی آخری ساحرہ، یا کوئی خلد افروز نوجوان لڑکی آخر یہ مصطفےٰ کمال پاشا، اسٹالین، ہٹلر، جاپان، مسولینی، فرانکو اور ملّا رموزی کو اپنے اپنے مقاصد اور ارادوں سے باز کیوں نہیں رکھ سکی؟ اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آخر دُنیا کے تمام پرستانوں اور دوشیزہ لڑکیوں کے تمام جمالیاتی معجزے اور کرامتیں کیوں ناکام رہیں؟ پس حسین لڑکیوں کی اس ناکامی کے اسباب کی تحقیق میں یہ نیاز مند ملّا رموزی مصروف ہے، اگر "خیام" کا پھر کوئی جنگ نمبر شائع ہوا تو یہ نیاز مند اس میں بتادے گا کہ حسین سے حسین لڑکی بھی اس وجہ سے مشاہیر عالم اور ملّا رموزی کے دل پر قبضہ نہیں کر سکتی!

حقیقت یہ ہے کہ "سمندری سیاست" "موجودہ جنگ اور اسلامی دُنیا" "بحری آلات" "فرانس کا خط دفاع اور اس کے بانی کے حالات" "مشاہیر جنگ" "جرمنی کا عروج و زوال" "جرمنی کی نوآبادیاں" "اسٹالین کے پُر اسرار عزائم" "آلات حرب" وغیرہ ایسے قیمتی مضامین ہیں، جن کے ذریعہ عام اخبار بین لوگوں کو معلومات کے بڑے بڑے ذخیرے مل سکتے ہیں،

اور وہ بھی بلکہ چار آنہ میں، مگر مصیبت تو یہ ہے کہ ہندوستان کے نوجوان تو علم اور اخبار سے کہیں سوا سینما پر مرتے ہیں، اور اب مرتی بھی ہیں، خصوصاً انگریزی لکھے پڑھوں میں اُردو سے زبانی ہمدردی تو اب مذہب سے زیادہ ہو گئی ہے، مگر اصلیت میں یہ طبقہ اب بھی اُردو کے اخباروں سے کوسوں دور ہے، کاش آپ کے جنگ نمبر کو گورنمنٹ پولیس کی طرف سے ڈنڈے کے زور سے خرید کرایا جائے تو بہت ہی بہتر اور قرین انصاف ہو، یا پھر اتنا انتظام کیجئے کہ مجھے کہیں کا کوتوال ہو جانے دیجئے، تو پھر اپنے حلقہ میں آپ کے جنگ نمبر کے خریدار پیدا کر کے دکھا دونگا کہ ایسے حسین و جمیل اخبار کی یوں قدر کرتے ہیں! مگر خیر زندہ دلان پنجاب کے جنگی اور مردانہ ذوق سے امید ہے کہ وہ میرے کوتوال ہونے سے پہلے ہی اس جنگ نمبر کی کئی اشاعتیں مقبول کرا کے چھوڑینگے ورنہ غضب ہوگا کہ سانڈے کا تیل، دانتوں کا منجن، آنکھوں کا سرمہ، سفوف ہاضم، اور "قیامت نامہ" تو لاکھوں روپیہ کا فروخت ہو جائے، حد یہ ہے کہ جنگ ہونے پر بھی نوجوانوں میں سینما اور فینسی اشیاء کی خریداری برابر ہوتی رہے اور جنگ نمبر ایسے محققانہ اور زندگی آموز اخبارات فروخت نہ ہوں، مگر یہ سب قصور ہے اُن ہندوستانی پروفیسروں اور ہندوستانی

ماسٹروں کا جنہوں نے اپنے ہندوستانی شاگردوں کے دلوں میں اُردو کی وقعت ہی نہ بڑھائی اور آج بھی اُن کے سامنے یورپی لباس ہی میں استادی کی شان دکھانے کو اپنے دماغ کی بڑی اُونچی اُڑان سمجھتے ہیں، حالانکہ عقل اُن کی اس تقلید پر ہنستی ہے،

امید کہ آں محترم مع الخیر ہونگے اور اس طرف بھی سردی کم ہوگئی ہوگی، میں نے تو معصوم بچوں سے دعا کرائی تب کہیں اس طرف سردی قدرے کم ہوئی ہے، اور بھئی کتنے دنوں سے لکھ رہا ہوں کہ اگر اُس طرف خالص گھی کی فصل شروع ہوگئی ہو تو چند سیر ہی اپنے بھتیجے کے عقیقہ کیلئے بھیجدیجئے، کہ یہ تقریب محض خالص گھی نہ ملنے کیوجہ سے رُکی ہوئی ہے، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا، اور ہاں بھئی وہ خوب یاد آئی یعنی برادر محترم حافظ محمد عالم صاحب سے بعد سلام و اشتیاق ملاقات کے کہدیجئے کہ آپکو بچے بہت یاد کرتے ہیں، آخر اس خاموشی کا کیا مطلب؟

المرقوم ۷۔ فروری سنہ ۱۹۴۰ء

(۲)

ایڈیٹر خیام لاہور کے نام

محترم م بی، کام شبلی! بڑے ہو تو مدظللکم، اور چھوٹے ہو تو سلکم!

"خیام" کا سالنامہ اس طرح ملا جس طرح کسی بدنصیب عاشق کو برسوں کی مایوسی اور تکلیف کے بعد اس کی محبوبہ اچانک مل جائے، میں نے مارے خوشی کے بغیر بسم اللہ کے اس کو پڑھنا شروع کیا،

واضح ہو کہ جنگ جرمن شروع ہو چکی ہے، ہندوستانی مرد اور عورتیں گویا اپنے اپنے پیدائش کے دن سے آج تک جنگ، میدان جنگ اور آلات جنگ سے اتنے دُور ہیں کہ ان کے محلہ میں اگر پٹاخہ کی آواز ہو جائے تو موٹی موٹی عورتیں تک اپنے بچّوں کو کلیجہ سے لگا کر کمروں میں "خدا خیر کرے" کہکر بھاگ جاتی ہیں اور بند ہو جاتی ہیں، اسی لئے جب سے جرمنی کی جنگ شروع ہوئی ہے اچھے اچھوں کے حواس خراب ہیں، یعنی میں نے تو جنگ کی گھبراہٹ کا یہاں تک اندازہ کیا کہ جس طرح بازاروں میں تاجروں نے اشیاء تجارت کا نرخ اُونچا کر دیا ہے اسی طرح بعض کوٹھی اور بنگلہ والوں نے جنگ جرمنی کے نام

غریبوں اور حاجت مندوں سے اپنی گفتگو کا نرخ بھی اُونچا کر دیا ہے، یعنی جنگ
ہورہی ہے چھ ہزار میل دُور اور کام بند کر بیٹھے ہیں ہندوستانی، یعنی جو ہندوستان
ظاہر کیجئے جواب ملتا ہے کہ جنگ کا معاملہ طے ہو جانے دیجئے پھر دیکھا جائے گا
غرض ایک کروڑ کہوں کہ ایک ارب خطرے ہیں جو جنگ سے ہندوستانیوں کے
دماغوں کو کھا رہے ہیں، پس گویا میں اور میری شیر دل چھوٹی بیوی ہے جو کسی خوف
کی پروا نہیں کرتی، البتہ اتنا تجربہ ضرور ہو گیا کہ جنگ کے زمانہ میں غیر انگریزی
دان بیوی سے زیادہ خطرناک نہ بم ہے نہ مشین گن، نہ جرمنی کا توپ خانہ،
فرانس کے سپاہی، وجہ ظاہر ہے، یعنی ایسی بیوی پر نہ ریڈیو کی خبروں کا اثر
نہ اخباروں کی اطلاع کو وہ سمجھے، البتہ سمجھے تو وہ سمجھے جس سے اسکو خدا سمجھے ایسی
ایسی ہی بیوی ہوتی ہے، جو جنگ کے حالات کو سمجھنے پر تُل جائے تو شوہر سے بھی
سمجھ لے اور نہ سمجھنے پر ڈٹ جائے تو شوہر تو ایک طرف سسر بھی سمجھائے تو
نہ سمجھے، لیکن وہ تو میں یوں زندہ ہوں کہ میں اپنی بیویوں کو خود چاہتا ہوں، بیوی
تو وہ مصیبت اور تباہی میں رہتی ہے جو اپنے لئے خود پسند نہ کر سکے یا پھر خو
پسند کرے، لیکن بیوی وہ نفع میں رہتی ہے جس کے گھر کے آس پاس شوہر
بقلم خود گھومتا پھرے، کیونکہ اس طرح پھر عمر بھر شوہر ہی کو خوشامد کرنا پڑتی ہے

اور جو بیوی خود شوہر پسند کرتی ہے وہ عمر بھر شوہر کی غلام رہتی ہے، پس اَب جو میں خود بیوی کا مرید ہُوں تو خاص معاملہ پڑا ہے منطقی بیوی سے اور میں چاہتا تھا فلسفی بیوی، تو ایسی صورت میں علمی قاعدہ سے مصیبتیں میرے حصّہ میں آئی ہیں اور راحتیں منطقی بیوی کے حصّہ میں، مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ سالنامہ خیام اُن کی خدمت میں جاکر علم منطق کی وہ ادق اور مشکل کتاب بن گیا، جس سے عاجز آکر اکثر عربی کے طلبہ عربی زبان کے علوم کو ترک کر کے لوہاری، نجاری اور بیکاری کے کمالات کو حاصل کر لیتے ہیں، مگر نہیں پڑھتے تو منطق، اس لئے ملاحظہ فرماتے ہی بس میں تھا اور اُس طرف سے:-

"تو یہ سالنامہ کون صاحب نکالتے ہیں"؟

"یہ تو بہترین پرچہ ہے"۔

"اس سے پہلے آپ نے مجھے اس کے اور پرچے کیوں نہیں دکھائے"؟

"اس پر تو خاصا روپیہ خرچ ہوتا ہوگا"!

"یہ کتنی تعداد میں چھپتا ہے"؟

غرض ہر سوال میں آپ کی تشریف آوری اور جوابدہی کی ضرورت تو تھی مگر میری ضرورت ایک سوال میں موجود نظر آئی، تو میں نے ادب سے عرض کیا

کہ اگر کبھی کبھار بیوی سے کوئی کام غلط ہو سکتا ہے تو مان لیجئے کہ اس مرتبہ ہم دو مردوں نے مل کر یہ حماقت کی کہ ایک نے سالنامہ "خیام" تیار کر دیا، اور دوسرے نے آپ کی خدمت میں پیش کر کے آپ کے سوالوں کا پہاڑ اپنے ترکی ٹوپی کے قابل سر پر اٹھا لیا، اب جس طرح اس غریب کا خدا حافظ، اسی طرح آپ کے سوالوں کے جوابات کا بھی خدا حافظ!

اب سوال تھا اس کا کہ مجھ ایسا عورت نواز کسی عورت کا دل دکھا سکتا ہے؟ سو یہ بس کا نہیں تھا، اس لئے میں نے سالنامہ کو یوں "پیان" کیا کہ اس کے مضامین کی ترتیب بے حد ضابطہ لئے ہوئے ہے، تصاویر کے فن سے میں خود ناواقف ہوں، اس لئے ان کے لئے آپ خود فیصلہ فرمالیں،

ظاہری شکل وصورت، کاغذ اور لکھائی چھپائی اتنی بہتر ہے کہ اگر بی اے کے نصاب میں یہ سالنامہ داخل ہوتا تو میں محض اسی خوبصورتی کی وجہ سے دس مرتبہ بی اے کا امتحان دینے کے لئے تیار ہو جاتا،

مشہور لوگوں کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے تو جب ابوالکلام آزاد ایسے رئیس المشاہیر شاعر کی غزل تک اس میں موجود ہے تو اب اس کے بعد گاندھی جی کی غزل ہی اور رہ جاتی ہے، ورنہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک اردو کا

اخبار اپنے سالنامہ میں کیا ستارۂ مشتری اور ناہید لے آئے؟

"دنیائے اسلام کا سیاسی مستقبل"۔ مولوی اظہر امرتسری نے اس کمال جامعیت سے لکھ دیا ہے کہ نہ گھومے عالم اسلام میں اُن کا مضمون ہی پڑھ لیا، اور سارے عالمِ اسلام کی سیاسی زندگی معلوم کرلی، نہ پاسپورٹ حاصل کرنے کی مصیبت میں مبتلا ہوئے، نہ غیر حکومتوں نے جاسوس تصور کیا، حالانکہ بعض کم تجربہ عورتیں ہر مضمون نگار کو خوفناک ڈاکو سمجھتی ہیں اور ڈرتی ہیں، گویا یہ مضمون نگار اسی لئے پیدا ہوئے کہ جس نے اس سے بات کی کہ اس نے مضمون لکھا، یہ تجربہ نہ ہونے کا اثر ہے،

سالنامہ میں ایک افسانہ "نگاہیں" ہے، یہ افسانہ پروفیسر سید آختر صاحب ایم اے اور نیوی کا لکھا ہوا ہے، اس افسانے نے میری اور میرے چار فاضل دوستوں کی جان لینے میں کمی نہیں کی، وہ تو کہئے کہ گورنمنٹ کی مداخلت سے ہم پانچوں بروقت خودکشی سے روک دیئے گئے، اور مجھے زیادہ لحاظ تھا اپنی چھوٹی بیوی کی محبت کا، ورنہ اس افسانہ کو پڑھ کر مر ہی گیا ہوتا، ارے بھئی غضب خدا کا اس شخص نے صرف نگاہوں سے ایک کامل عشق کو جس قدرتِ کلام سے پورا کر دکھایا ہے، اور عورت کی عاشقانہ اور محبوبانہ فطرت، جذبات، حرکات اور نفسیات کی

جس فطری اور قلبی دھڑکنوں تک اس پروفیسر کی نظر جا پہنچی ہے، میری رائے میں تو ایک عورت نہیں جو اس افسانہ کے ایک نقطہ سے انکار کرے، اور ایک مرد نہ ہوگا جو اس کے ایک شوشہ سے انکار کرے، اور ویسے تو ایسی عورتیں بھی ہیں جو اپنی اولاد تک کا گلا گھونٹ دیتی ہیں، اور ایسے ہی مرد بھی ہیں جو میرے اس لکھے پر بھی اس سالنامہ کو نہیں دیکھتے، حیران ہوں کہ اس افسانہ کی تعریف میں کیا لکھ دوں، بس یہ لکھتا ہوں کہ میری ساری عمر میں جتنے افسانے پڑھ کر میں اب تائب ہوا تھا، اس افسانے نے پھر افسانہ خوان بنا دیا اور پولیس کے سامنے عہد کرنے کو تیار ہوں کہ پڑھوں گا تو صرف پروفیسر سید اختر اورینوی کا افسانہ، ورنہ دعائے گنج العرش اور مولٰنا اشرف علی قبلہ کی بہشتی زیور ہی بہت ہے،

بات یہ ہے کہ اردو میں آج جو انبار در انبار افسانے نکل رہے ہیں یا شائع ہو رہے ہیں، وہ کم علموں، ناتجربہ کاروں اور بے نظر نوجوانوں کی جذباتی پیداوار ہوتے ہیں، اسی لئے وہ عقل و فطرت اور عام عادت کیخلاف ہوتے ہیں، یہی حال اردو کی غزل کا ہے، جس میں ۹۹ فیصدی واردات و واقعات یا تو حد سے گذرے ہوئے پیش پا افتادہ، بازاری، اور درجہ سوم کے ہوتے ہیں، یا پھر

یکسر خلاف عقل و عادت، اور اُردو میں ایسی خرافات ایسے ہی دماغوں کا صدقہ ہے جو خود کم علم، ناتجربہ کار اور غیر محقق ہیں، لیکن سید اختر صاحب کا افسانہ مرد و عورت کے عشق کا وہ اہم ترین افسانہ ہے، جس میں افسانہ نگار نے داد تحقیق و نظر کو بکمال قدرت پُورا کر دیا ہے، غضب پہ غضب یہ کہ ایک مشرقی عورت، ایک نوجوان عورت اور ایک باحیا عورت، صرف نظر کی کشش سے جن فطری مدارج سے گذر کر اپنے عاشق یا اپنے محبوب تک آتی ہے، اس کو کہہ دینا تو شاید میرے لئے بھی آسان تھا، مگر جزئیات کیساتھ لکھ دینا صرف اختر ہی کے بس کا تھا، منزل حسن و عشق میں عورت کے حجابات، عورت کی مشکلات، عورت کے احساسات اور عورت کے دل کی دھڑکنوں تک پہنچکر عورت کے اقدامات کو درجہ تکمیل تک پہنچا دینے میں اختر کے موئے قلم نے جو نزاکتیں دکھائی ہیں وہ فطرت کی نباضی کی ایک ایسی لاجواب مثال ہے جس کو سمجھ لینے کے لئے ۱۹۳۹ء میں بھی عاشق ہو کر اس افسانہ کو پڑھنا ضروری ہے، بے عاشق ہوئے اور غیر محقق ہو کر ناممکن ہے جو اس افسانہ کو سمجھ سکے، واقعہ یوں ہے کہ صرف نظر کی حرکت سے عشق کو بھانپ لینا صرف ایک نوجوان لڑکی ہی کا کام ہے، گاندھی جی کے بس کا رنگ نہیں، پھر محبت کرنے والے کے لئے شوہر تو کیا ساری دُنیا کے خطرات، مشکلات، موانع،

حجابات، اور جان تک دیدیتے ہیں، ایک نوجوان لڑکی جس بہادری، جس ہمت، جس دلیری، جس بے جگری اور جس استقلال سے کام کرتی ہے، ہٹلر اور مسولینی بھی اس ہمت سے کام نہیں لے سکتے، اس لئے کہ عورت اپنے سے عشق کرنے والے کے لئے جس درجہ مہربان اور محبت کرنیوالی ہے دُنیا میں کسی اور سے نہیں، اسی لئے میں ایسے افسانوں کا قایل نہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ عورت محبّت قبول کرکے بھی محض حالات کی نامساعدت کے باعث اپنے عاشق تک نہ پہنچ سکی، یہ عورت کی صحیح فطرت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے، ورنہ عورت کی پیدائیش ہی محبّت ہے اور محبت ہی اس کی موت، اور وہ محبت کی موت سے کبھی نہیں ڈرتی، بشرطیکہ اس سے محبّت کرنیوالا بھی عالی دماغ ہو، بہادر ہو، اور اسکا سچّا پرستار، الحاصل آپنے سالنامہ میں اس افسانہ کو شایع فرماکر کم سے کم مجھ پر تو بڑا احسان فرمایا، اللہ اس کے بدلے گورنمنٹ سے آپ کی اور اختر صاحب کی جاگیر اور منصب کرادے،

دیگر احوال یہ ہے کہ "خیام" کے پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں اگر اس سالنامہ کو صرف اختر صاحب ہی کے افسانے کی خاطر خریدلیں تو میں سمجھوں گا کہ ہندوستان بھی جمالیات اور آرٹ کا قدردان ہو چکا ہے، مصیبت تو

صرف یہ ہے کہ خود محبت کرنے والوں میں ابھی حسن و عشق کی وہ قدر و قیمت نہیں جو آرٹ نے لگائی ہے، یہاں تو عاشق کو تھکا تھکا کر مار ڈالنا عین حسن ہے اور محبوبہ کو تیل ڈال کر آگ لگا دینا عین عشق ہے، حالانکہ عاشق کا رُتبہ عورت کے لئے تاج و تخت کے رتبہ سے بلند ہونا چاہئے اور محبوبہ کا رتبہ عرش و کرسی سے کچھ ہی نیچے، سو یہ بات اس افسانہ میں موجود ہے،

اب رہے آپ کے سالنامہ کے دُوسرے افسانے، سو اگر میں ان سب افسانوں کی تعریف خود ہی لکھ دُوں تو پھر کس کو ضرورت ہے کہ وہ عشق و جمال، علم و حکمت اور شعر و شراب کے اس دلکشا ذخیرہ کو خود ملاحظہ فرمائے،

---

(۳)

ایڈیٹر صاحب "خیام" کے نام

محترم مدیر "خیام"!

محترم حافظ محمد عالم صاحب مدیر "عالمگیر" و "خیام" سے میری اس وقت سے دوستی ہے جب آپ بچے ہوں گے، موصوف چونکہ اگلے وقتوں کے بزرگوں

کی تربیت اور اسلامی اخلاق کا وہ نمونہ ہیں جو ایم اے کے نصاب میں نہیں ہے، اس لئے آپ ان اصول پر عامل ہیں جن میں مروّت، پیار، وفا، وضعداری اور حسن سلوک کی بجا آوری نصف حج کے برابر سمجھی جاتی ہے، پس رمضان شریف کی اس پہلی رات کو جس کے لئے قدیم وضع کے مسلمان سال بھر دعائیں مانگتے ہیں کہ آئے، اور مسٹر قسم کے لوگ اس کے تصور تک سے گھبراتے ہیں، مجھے قبلہ خواجہ حسن نظامی مدظلہٗ کے اخبار "منادی" کے ساتھ حافظ محمد عالم صاحب مدیر "خیام" کا یہ خط ملا کہ:-

مکرمی! سلام مسنون!

میں کل صبح پنجاب میل سے جو ۸ بجکر ۳۰ منٹ پر دہلی سے چھوٹتا ہے بمبئی جا رہا ہوں، غالباً یہ گاڑی ۹ - ۱۰ بجے کے درمیان بھوپال پہنچتی ہے، اگر آپ سے بھوپال اسٹیشن پر ملاقات ہو جائے تو زہے نصیب!

(محمد عالم)

واضح رائے عالی باد کہ یہ خط رمضان کی پہلی رات کو ملتا ہے اور اب رمضان کی یہ رات کسی طرح بھی ملتوی نہیں کرائی جا سکتی ہے، ادھر حافظ صاحب قبلہ کی طرح ملا رموزی بھی حافظ قرآن ہے، اور یہ سال اس کے حفظ قرآن کا چوبیسواں

سال ہے، لہٰذا وہ تراویح پڑھتا نہیں بلکہ پڑھاتا ہے، پھر تراویح بھی پہلی رات کی، ادھر آپ جانتے ہیں کہ مسلمان سیاسی معاملات میں خاک نہیں مگر وہ مذہب کے نام پر آج بھی اتنا مشہور ہے کہ بے مقدرت بھی ہزاروں کی تعداد میں حج کو جاتا ہے اور کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ بے استطاعت حج کس نے فرض کیا ہے، اس لئے اندیشہ تھا کہ اگر امامت چھوڑ کر حافظ صاحب کی ملاقات کو جاتا ہوں تو تمام نمازی میرے خلاف علم بغاوت بلند کر دینگے اور نہیں تو بائیکاٹ، عدم تعاون، ستیہ گرہ، نان وائیلنس اور بھوک ہڑتال سے کام لیں گے، اور یہ بھی نہیں تو کم سے کم مجھے دہریہ، ملحد، قادیانی اور وہابی تصوّر فرمائیں گے، اور ظاہر ہے کہ آجکل کے مسلمان صاحبان کے جہاد کا سارا زور اِن فرقوں کی تباہی اور ان کو بُرا بھلا کہنے پر صرف ہو رہا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ میں تراویح چھوڑ کر حافظ صاحب سے ملاقات کرونگا اور ادھر تمام محلّے کے انگوٹھے لیے کے نشانات کیساتھ میرے خلاف پوسٹر، اعلان، اشتہار، مضامین، اشعار اور پمفلٹ تک شائع ہو جائیں گے، کہ ملّا رموزی نے عمر بھر قوم اور ملک کے لئے جو کچھ کیا وہ تو گیا بھاڑ میں، مگر ہاں وہ بے نمازی، درمنڈا اور وہابی ہے، لہٰذا اسکا بائیکاٹ، اس لئے میں نے منافقوں کی طرح یا آج کل کے بعض

دولت مندوں کی طرح دل میں طے کر لیا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر جاؤں گا مگر تماز بول
سے نہ کہوں گا کہ مجھے جلد جانا ہے، ہاں وہ جو آجکل کے دولت مندوں کے لئے
میں نے کہا ہے، سو اسکا مطلب یہ ہے کہ بعض ایسے دولتمند زندہ ہیں جو ملاقات
کے وقت آپ کے لئے بڑے ملنسار، بڑے بے تکلف نظر آئیں گے، اُن کے
اس برتاؤ سے آپ طے کر لیں گے کہ اب کیا ہے دوستی ہو گئی، یارانہ ہو گیا، خوب
ملتے رہیں گے، بڑا نفع دینگے، لیکن آئندہ جہاں آپ نے اسی اعتماد سے اُن سے
ملنا چاہا کہ پھر اُن سے اُونچا منافق، غیر مہربان، اور آپ کی ملاقات سے بھاگنے
والا نہ ملیگا، یہ کیوں محض اس لئے کہ ایسے لوگ آپ ایسے اخبار نویسوں، مضامین
نگاروں اور شاعروں کے ملنے سے یُوں گھبراتے ہیں کہ خود اخبار نویسی کا فن جانتے
نہیں، شعر و مضمون کے صحیح الفاظ اور ان کے معنی تک سے بے خبر ہوتے ہیں،
اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی اخبار نویس اُن کے خلاف کچھ نہ لکھ دے، اور اُوپر
سے اُن کے آس پاس کے جاہل دوست بھی یہی کہتے رہتے ہیں کہ اخبار نویسوں اور
شاعروں سے دُور ہی رہنا، اس لئے ایسے دولت مندوں کے اخلاق منافقانہ
ہو جاتے ہیں اور نہ کسی حد سے گذری ہوئی بے بسی کے عالم ہی میں ہم سے آپ سے
ملتے ہیں، اب اُن سے لاکھ کہئے کہ ہم لوگ ہر ایک کے لئے تھوڑا ہی لکھتے ہیں،

تو بھی ان کو یقین نہیں آتا، اور یہ گھبراتے ہی رہتے ہیں، محض اس لئے کہ ان غریبوں کے پاس دولت ہوتی ہے، ہمارے آپ کے برابر علم نہیں ہوتا، اور ویسے بھی آپ نے دیکھا ہے کہ کافی علم غریبوں میں ہوتا ہے، اس لئے دیکھ لیجئے آج دُنیا کے گوشہ گوشہ میں مصطفےٰ کمال، رضا شاہ پہلوی، اسٹالین، ہٹلر، مسولینی، گاندھی، اور حضرت ملا رموزی کی جو شہرت ہے وہ دولتمندوں کی نہیں، حالانکہ یہ سب غریبوں کے بچے ہیں، اس لئے میں نے بجائے سات پارے پڑھنے کے پانچ پاروں پر تراویح ختم کردی، اور ریلوے اسٹیشن روانہ ہوگیا،

پُر لطف بات یہ تھی کہ ایڈیٹر صاحب "خیام" نے اپنی گاڑی کا وقت ۹-۱۰ کے درمیان لکھا تھا مگر میں ۹ بجے سے پہلے ہی روانہ ہوگیا اور یہ ہر غریب آدمی کرتا ہے محض اس لئے کہ اس کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچنے اور پہنچانے کے لئے نہ خدام ہوتے ہیں نہ موٹر کاریں، ادھر دُنیا کی فطرت اندھی واقع ہوئی ہے یعنی طے شدہ سی بات ہے کہ یوں تو ریل ہمیشہ لیٹ آئیگی، لیکن جس دن آپکو گھر پہ ۲ منٹ بھی دیر ہوجائیگی اس دن کے برابر ریل صاحبہ عمر میں کسی وقت کی پابند نہ ہونگی، اور وقت سے بھی ایک آدھ سیکنڈ پہلے ہی گذر جائیگی، بس میں روانہ ہوا اور ایڈیٹر صاحب سے اسٹیشن کی کلہم ۶ منٹ کی گفتگو کا خاکہ بنانے میں محو ہوگیا،

میں نے سوچا کہ کہوں گا کہ دیکھئے یوں میں کس لائق ہوں، مگر ہاں وہ جو ایک قدردان طبقہ میرے مضامین اور غزلوں کو کافی محبت سے پڑھتا ہے خصوصاً میری انگریزی داں بیوی نمبر ۴، تو اس لئے براہ کرم میرے مضامین اور غزل کو "جنام" میں ذرا نمایاں جگہ عطا فرمایا کیجئے، نہیں نہیں حافظ صاحب تعریفی نوٹ کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خواہ مخواہ لوگوں کو یہ فارسی بولنے کا موقع ملیگا کہ ؏

من ترا حافظ بگویم تو مرا حافظ بگو!

اس لئے دل بڑھانے والا نوٹ تو کیا ہاں مگر ذرا نمایاں جگہ،

پھر کہوں گا، اور مشرقی تعلیم کے اثر سے، بڑی دبی زبان سے کہوں گا کہ براہ کرم میرے معاوضہ کا معاملہ.......... جی ہاں میں خود تو عرض کر رہا ہوں کہ جب "جنام" اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے، مگر بھولئے گا نہیں، کیونکہ میں ہوں قوم کا مسلمان، اور مسلمانوں کی رائے یہ ہے کہ اُن کے علمی و قلمی خدام کو بس بقدر قوتِ لایموت اور ایک سائیکل کافی ہے، چاہے اُن کے ساتھ بارہ[۱۲] بچے اور چار[۴] بیویاں ہوں، البتہ بھاری تنخواہ کے مستحق تو ریلوے کے ملازمین اور موٹر ڈرائیور ہوا کرتے ہیں، کیونکہ یہ غریب ادیبوں اور مضامین نگاروں سے کہیں سوا قابل ہوتے ہیں، ملّا رموزی تو صرف مذاقیہ مضامین لکھتے ہیں جن سے نہ علم و ادب کو فائدہ نہ

مُلک و قوم کو نفع!

اس کے بعد ریل کے جانے کا وقت ہو جائیگا، تو مارے گھبراہٹ کے ہماری آپ کی گفتگو یُوں ہونے لگے گی، کہ اچھا خدا حافظ، اب آپ گاڑی میں بیٹھ جائیے، دیکھئے وہ سگنل ہو گیا، نہیں نہیں ابھی تو ۲ منٹ اور ہیں، دیکھئے مگر مضامین کا سلسلہ بند نہ ہو، میں انشاء اللہ سب سے پہلے آپ ہی کو معاوضہ دُونگا، اچھا خدا حافظ مگر ابھی تو گارڈ نے سیٹی نہیں دی، جی ہاں جی ہاں ضرور ضرور مگر یہ تو فرمائیے کہ وہ آپ کی بیوی نمبر ۲ تو خیریت سے ہیں، میں ان کا حال دریافت کرنا تو بھول ہی گیا، کیا واقعی آپ نے دُوسرا نکاح فرما لیا ہے یا یہ بھی کوئی مذاق ہے؟ اس پر میں ایک مرتبہ "آہ" کرونگا اور کہوں گا کہ حافظ صاحب بس نہ پوچھئے اس بیوی نمبر ۲ کی تفصیل، السلام علیکم، مگر خدا کے لئے مضامین نہیں تو ظالم خیریت ہی کا خط تو لکھ دیا کرو، وہ آپ کے لاہوری احباب اکثر دریافت کرتے ہیں خاص کر مولینا ظفر علیخاں، مولانا سالک، مولینا حکیم یوسف حسن، مولینا عطاء اللہ شاہ بخاری، پطرس تو دہلی میں "ریڈیو رساں" بن گئے ہیں، جی ہاں امتیاز علی تاج اچھے ہیں، کہتے تو تھے کہ میں مُلّا رموزی سے شرمندہ ہُوں کہ اپنے نکاح میں اُن کو بُلانا بھول گیا، خیر انشاء اللہ کسی بچہ کے ختنہ میں تار کے ذریعہ بلاؤنگا، جی ہاں

لالہ کرم چند اچھے ہیں مگر آپ سے شاکی ہیں کہ آپ ان کے اخبار "پارس" کو بھول گئے، آیئے نا تو پھر لاہور، آجکل وہاں کا موسم بھی اچھا ہے، اور وہ آپ کے پہلے میزبان، "خانصاحب" حفیظ جالندھری اور مولینا حفظ الرحمٰن بھی آپ کو یاد فرماتے ہیں، خدا حافظ، مگر دیکھئے وہ معاوضہ کا معاملہ نہ بھول جایئے گا، بیٹھے بیٹھے، دیکھئے سیٹی ہو چکی ہے، آپ مضامین کی طرف سے اطمینان رکھئے، اللہ کا دیا بہت کچھ ہے، اور ہاں دیکھئے بمبئی سے واپسی پر ایک دن کے لئے میرے ہاں ضرور قیام فرمائیے گا گو اس مرتبہ کی بارش سے مکان جو منہدم ہو گیا ہے تو آج تک مرمت نہیں ہو سکی کیونکہ مسلمانوں کا خیال ہے کہ ملا رموزی کو جو کچھ مل رہا ہے وہ بہت ہے، حالانکہ اس میں سے ۲۵ روپیہ اس ماہ کم ہو گئے ہیں، اناللہ، کیا ۲۵ روپیہ آپ کے کم کر دیئے گئے، لاحول ولاقوۃ جب تو کہتا ہوں کہ آپ لاہور تشریف لے آیئے اور "خیام" کو سنبھالئے اچھا خدا حافظ! "خیام" کو اپنا ہی سمجھئے، السلام علیکم، ضرور ضرور انشاء اللہ واپسی کی اطلاع ایک ہفتہ پہلے ہی دونگا، السلام علیکم، کیا ہوا؟ گاڑی چلتے چلتے رک گئی، جی ہاں کوئی امیر مسافر آگیا ہوگا، جس کو انگریزی میں فرسٹ کلاس مسافر کہتے ہیں اور دنیا میں جو کچھ ہے سو امیروں کے لئے ہے، ہمارے آپ کے لئے تو عقبیٰ میں ہے، چلئے ۲ منٹ اور مل گئے مگر ملا صاحب یہ سنکر مجھے بے حد افسوس ہوا کہ آپ کے

۲۵ روپئے کم ہو گئے، آہ اہل ہنر کی قدر نہیں، مگر گیا ان کے اجرا کی کوئی ترکیب نہیں، میں "خیام" میں کچھ لکھوں؟ نہیں نہیں، یہ کوئی تنخواہ نہیں تھی بلکہ ایک خاتون دیتی تھیں جو تاجر ہیں، اور اس مرتبہ ان کو تجارت میں خاصا نقصان ہوا، اس لئے غریب نے بڑی معذرت کیساتھ یہ رقم بند کی ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ عورت کا دل کتنا، اسی لئے تو وہ ذرا سے حالات بدل جانے سے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتی ہے اور وعدہ خلافیوں پر اتر آتی ہے، اور نام یہ ہے کہ عورت کے برابر نہ کوئی مضبوط نہ وفادار! السلام علیکم دیکھئے خط السلام علیکم،

یہ اور اسی قسم کے خیالات کو لئے میں بڑے شوق سے ایڈیٹر صاحب "خیام" سے ملنے جا رہا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پہلے پھاٹک کو بند پایا، گھبرا کر سائیکل کو ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگایا، مگر آپ جانتے ہیں کہ آجکل جب انگریزی تعلیم نے عورت تک کی عادتیں بدل دی ہیں، تو سائیکل بھی آخر مؤنث ہے کہ وہ پنجاب میل روانہ ہوا، اور میں ایک مایوس مسافر کی طرح پھاٹک ہی پر ٹھہر گیا، اور دل میں فطرت کے اس یکسر اوندھے ضابطہ کو گالیاں دینے لگا، کہ جس کو چاہو وہی نہیں ہوتا ہے، اور بھی قسم لے لو یہی پنجاب میل کی بچی ڈھائی ہزار مرتبہ لیٹ آئی ہے اور لیٹ بھی کیسی کہ دس دس گھنٹہ، مگر آج وہ جب مجھے اس سے کام تھا تو یوں وقت پر آئی

گویا آفتاب تھی، کہ وقت پر طلوع ہو کر رہی، ادھر دوسری پشیمانی کہ حافظ محمد عالم صاحب دل میں کہتے جلتے ہوں گے کہ ماتار موزی جو خود کو باغی، نمک حرام، بے وفا اور فرعون سامان لکھا کرتا ہے، تو ہے بھی سچ کہ دیکھو میرے وقت پر اطلاع دینے کے باوجود نہ آیا۔ اس سلسلے میں نے ریل کی پٹری سے قریب ہو کر حافظ صاحب کے پنجاب میل کے انجن کے نمبر نوٹ کر لئے جو ۱۲۱۴ تھے، اب جھانسی سے دریافت فرما لیجئے کہ ۵۔ نومبر کی شب کو بھوپال سے جو پنجاب میل گذرا اس کے انجن کے نمبر ۱۲۱۴ تھے یا نہیں؟

(۴)

ایڈیٹر صاحب "خیام" لاہور کے نام

محترم حافظ محمد عالم صاحب مدیر مجلہ "عالمگیر"! السلام علیکم۔

آپ کا وہ خط آثار قدیمہ کے محکمہ کو پیش کر دینے کے قابل ہو چکا ہے جس میں جناب گرامی نے اخبار "خیام" کے جاری فرمانے کا ارادہ لکھا تھا، اور مجھ قدیم نمک خوار سے اس کے لئے مضمون طلب فرمایا تھا، میں نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ

خیام کا پہلا پرچہ دیکھ لُوں تو لکھوں، مگر جس طرح قبلہ خواجہ حسن نظامی کی قسمت میں یہ لکھا تھا کہ وہ اپنی کتابوں کو اپنی ہی زندگی میں فروخت ہوتا دیکھ کر اپنی اولاد کی اولاد کو بھی دیکھ لیں، ضروری نہیں ہے کہ میں بھی اسی طرح اخبار "خیام" کو دیکھ لیتا، اس لئے وہ اس خط لکھنے سے پہلے آیا نہ اب آیا، البتہ بعض ایسے لوگوں سے خبر ملی کہ "خیام" جاری ہو گیا جو مقامی اخبار فروشوں سے صرف اس لئے بڑے خلوص سے ملتے رہتے ہیں کہ وہ ان کے اخبارات کو روزانہ مفت چاٹ جاتے ہیں اور اخبار فروش مارے مشرقی مروت کے تمام حروف تہجّی میں سے ایک حرف بھی نہیں کہتے،

اب جو یہ خبر ملی کہ "خیام" جاری ہو چکا، مگر مجھے نہ ملا تو معاً سمجھ گیا کہ یہ سہو ہے جناب کے مہتمم صاحب لاسلکی کا، یعنی مہتمم نشر و اشاعت کا، لیکن پھر جو غور کیا تو سمجھ گیا اور دل میں توبہ کی کہ بیچارے مہتمم صاحب نشر و اشاعت کی خطا نہیں، بلکہ خود حافظ صاحب ہی کی خطا ہے کہ موصوف نے جس وقت مجھے بڑے لاڈ پیار سے لکھا تھا کہ "خیام" جاری ہو رہا ہے اگر اسی وقت مہتمم صاحب اشاعت سے فرما دیتے کہ دیکھو بھئی، مہتمم صاحب اخبار "خیام" جیسے ہی کہ اخبار خیام کا پہلا پرچہ چھپ چھپا کر، کٹ کٹا کر، سل سلا کر تیار ہو، سب سے پہلے اپنے ملا رموزی صاحب

کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے، پھر بھی مہتمم صاحب مجھے ارسال نہ فرماتے تو بے شبہ وہ خطاوار گردانے جاتے، لیکن جب اس غریب سے آپ کہنا ہی بھول جائیں تو میں ان کی شکایت کر کے اپنی عاقبت کیوں خراب کروں؟ ہاں یہ بھی تجربہ ہوا ہے کہ بعض "غریب غرباء" قسم کے صاحبان اہتمام و اشاعت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ایک پرچہ مضامین نگاروں کے نام روانہ کر کے پھر بھول جاتے ہیں اور تقاضوں پر تقاضے وصول ہونے پر جب تک وہ مضامین نگاروں کے نام کو رجسٹر میں درج فرما کر پتہ کی چٹ چھپوا نہیں لیتے پرچہ پابندی سے نہیں بھیجتے، مگر غالباً آپ کے مہتمم صاحب اشاعت ایسے نہ ہوں گے۔ لہٰذا اس طرح بھی آپ ہی کی خطا ثابت!

الحاصل مجھے تو اطلاع مل ہی چکی تھی کہ "خیام" کا پہلا پرچہ جاری ہو چکا، یعنی چھپ کر، لیکن مجھ سے چھپ کر فروخت ہو رہا ہے، اس لئے حسب وعدہ مجھے لکھنا پڑا، اب سوال یہ تھا کہ کیا لکھوں، جبکہ خیام تو سامنے ہے نہیں، معاً خیال آیا کہ جس طرح مجھ ملا رموزی کو ہر نادیدہ ایڈیٹر یوں لکھ دیتا ہے کہ "گو جناب سے شرف نیاز حاصل نہیں لیکن غائبانہ تعارف ضرور حاصل ہے اس لئے امید ہے کہ جناب اپنے تازہ افکار سے ہمارے پرچہ کو زینت عطا فرمائینگے"، اسی طرح مجھے بھی چاہئے کہ اخبار "خیام" کو دیکھے بغیر" اس پر غائبانہ اظہار خیال لکھوں؟!

وروہ دیکھئے تاکہ اپنے ہاں کی اُردو کی تمام غزلوں میں یہی تو ہوتا چلا آیا ہے
کہ شاعر صاحب والد اور نانا کی عمر کو پہنچکر بھی عاشق ہی بنے رہتے ہیں، حالانکہ
عمر کا یہ زمانہ تو بہ و استغفار کا زمانہ ہوتا ہے، مگر وہ جو نزع تک بھی اس حرکت
سے باز نہیں آتے تو اسی لئے کہ وہاں ہوتا ہوتا کچھ نہیں ہے بس تصور اور اندازہ
سے ایک محبوب یا محبوبہ طے کر لیتے ہیں اور اس پر غائبانہ طبع آزمائی فرماتے
رہتے ہیں، یہی تو راز ہے جو اُردو کی غزل حد سے سوا غیر عقلی، غیر واقعاتی، بلکہ
غیر فطری تک ہوتی ہے،

جب میں لاہور میں مقیم تھا تو آپ نے چور نظر سے میرے آس پاس ایسے
شعراء دیکھے ہوں گے جنہوں نے اس غیر فطری شاعری پر لعنت بھیجتے ہوئے نہایت
درجہ صحیح اور واقعاتی شاعری کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، ورنہ آپ بھی خدا کے
فضل سے مسلمان ہیں سچ فرمائیے کہ کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے یا آپ نے
کسی تعلیم یافتہ محبوب سے یا محبوبہ سے محبت کی ہو اور وہ محبت کا اظہار ہوتے ہی بعض کونوالوں
اور تھانیداروں کی طرح بے وفا، بے مروت، بے رحم، ستمگر، جفاجو، جفاکار،
جفا پیشہ، ستم شعار، ہمکار، اور حد یہ ہے کہ ہرجائی اور رقیب نواز بن گئی ہو، تو یہ
تو بہ آپ سے قسم کھا کر کہتا ہوں مگر خدا کے لئے کسی سے کہئے گا نہیں، یہ میرا

بہت بڑا راز ہے کہ میں نے جس محبوب یا محبوبہ سے اظہار عشق کیا اس نے میرے ساتھ وہ وفا کی، وہ محبت کی اور وہ عشق کیا کہ کو نو الی والے تک حسد کرتے تھے، البتہ ایک محبوبہ ایسی ملی جس کو میں "پتھر کی بنی ہوئی محبوبہ" کہتا ہوں، کہ گو میں نے اس کیلئے سینکڑوں غزلیں لکھیں، مگر اس نے ملاقات تو در کنار اپنے قلم سے ایک آدھ تشفی نامہ تک مجھے نہ بھیجا، سو میں نے معلوم کر لیا کہ اس غریب کو یہ کہکر ڈرا دیا گیا تھا کہ ملا رموزی سے دُور ہی رہنا، ورنہ وہ اخباروں میں تیرے خلاف مضامین لکھ دیگا، اِدھر وہ تھی کم تجربہ، بس آگئی کہنے میں، ورنہ وہ دل سے میری آج بھی بے حد قدردان ہے، لیکن یہ آپ کی اُردو کی غزل نے تو شروع سے لیکر آخر تک یہی بتایا ہے کہ محبوبہ ظالم، جفاکار، عیار، اور بے وفا ہوتی ہے، سو اسکا سبب یہ ہے کہ اُردو کے شعراء کو کوئی نصیب نہ ہوا، اور وہ جو کہتے رہے فقط غائبانہ، لہذا "خیام" پر میں بھی غائبانہ نظر ڈالوں تو غصہ نہ ہو جائیے گا، مطلع عرض ہے:۔

مثلاً میں نے دل میں سوچا کہ آپ ہیں آدمی ذی شعور، ذی ہوش، ذی مقدرت جدت پسند، اگرچہ گستاخی معاف آپ عمامہ ہی باندھتے ہیں جو جدت پسندی کا جانی دشمن ہے، لیکن یہ تو کوئی بات نہیں مجھی کو دیکھیے کہ میں یہ مضمون تہمد باندھ کر

لکھ رہا ہُوں تو کیا میں جدت پسند نہ رہا، اس لئے میں نے طے کیا کہ آپ نے اس اخبار میں ضرور جدت سے کام لیا ہو گا، اور کچھ نہیں تو اسکا پیمانہ اتنا طویل و عریض رکھا ہو گا کہ جب ۲ دو آدمی اسکو مُنہ کے سامنے تان کر کھڑے ہوتے ہونگے تب تیسرا آدمی اسکو پڑھتا ہو گا اور اس طرح اُردو کا یہ اخبار "پائنیر" "ٹائمز" اور "اسٹیٹسمین" سے بڑھ گیا ہو گا، اور مسلمان بھی فخریہ کہیں گے کہ ہمارا اخبار بھی اتنا بڑا ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے اشتہارات بھی کیا ہوں گے؟

میں نے پھر سوچا کہ آپ نے اس اخبار کی لکھائی چھپائی پر اتنی کافی رقم صرف کی ہو گی کہ اگر کافی خریدار نہ ملے تو آپ بند ہی کر دینگے، جیسا کہ "عالمگیر" کی نظر پرور لکھائی چھپائی کا آپکے یہاں بندوبست ہے، مگر قحط زدہ لکھائی چھپائی کو آپ برداشت نہ فرمائیں گے،

میں نے پھر سوچا کہ آپ نے اس کے صفحۂ اوّل پر حضرت خیام کی تصویر ضرور دی ہو گی، اگرچہ وہ تصویر ایسی ہی ہو گی جیسی کہ شاہنامہ والے فردوسی کی تصویر عمامہ بند ہے اور دیکھنے سے شیخ سعدی یاد آجاتے ہیں، اُن کی تصویر میں ان کے پاس شراب کی ایک صراحی اور ایک مٹی کا پیالہ رکھا ہو گا اور اُن کے مُنہ کے سامنے لاہور کے وائی، ایم ہی ہال کا مشاعرہ منعقد ہو گا، جس میں برادر محترم

سالک مدیر "انقلاب" بڑے دبدبے سے صدر بنے ہوں گے اور حضرت حفیظ
ہوشیارپوری تعارف کی تقریر فرما کر بیٹھے ہوں گے، کہ جناب احسان بن دانش
نے اپنی نظم شروع کردی ہوگی، اور لالہ کرم چند صاحب ایڈیٹر "پارس" قد آدم ہوکر
داد عطا فرمارہے ہوں گے، آہ لالہ کرم چند کس درجہ شریف اور وسیع المشرب بندہ
ہے جس نے قیام لاہور میں ملازمت کے لئے علاوہ دعوت ولیمہ کے قوالی بھی محفل
تک منعقد کرائی اور میری نمک حرامی دیکھئے کہ وہ دن اور آج کا دن جو اس غریب
کو ایک خط بھی لکھا ہو، مضمون دینا تو گویا کفر ہے، مگر پھر خیال آیا کہ آپ نے
اخبار خیام کے صفحہ اوّل پر اتنے بڑے مشاعرہ کی تصویر یوں نہ دی ہوگی، کہ خیام
مرحوم کو مشاعروں سے تعلق نہ تھا بلکہ میخانہ سے تھا، اور آپ کے شہر میں رہتے ہیں
ایک چھوڑ دو وہابی، یعنی علامہ ظفر علیخاں، اور علامہ حسین میر کاشمیری، لہٰذا یہ
لوگ اخبار پر میخانہ کی تصویر کس طرح برداشت کرتے،

تو پھر سوچا کہ ان لوگوں کی مخالفت کے تاؤ میں شاید آپ نے مسجد شہید گنج کی
تصویر دیکر مسلمانوں کو پھر سے بھڑکانے کی کوشش کی ہو، مگر پھر سوچا کہ آپ ٹھیرے
آدمی غیر سیاسی اس لئے آپ نے تصویر ہی نہ دی ہوگی کہ ہاں وہ آپ خود بھی تو
حافظ صاحب ہیں، پھر سوچا کہ اس اخبار کے صفحہ اوّل پر تو ہوگا اشتہار حضرت

عامل کریم الدین صاحب عملیاتی کا، یا جلی حروف میں لکھا ہوگا "بھلہ دی ہٹی"۔
اور صفحۂ آخر پر تو میرا دل گواہی دیتا ہے کہ "عالمگیر بک ڈپو" کے اشتہارات ہوں گے،
جن میں میری کتابوں کی قیمت میں رمضان شریف کی آمد کی خوشی میں رعائیت کی
گئی ہوگی،

میں نے پھر سوچا کہ اس کے سرورق پر ایک ایڈیٹر کے عوض لفظ ادارہ لکھا ہوگا
جس میں تین چار نام تو ہوں گے مولویوں کی طرح کے اور ایک نام منزور بی اے
ہوگا، میں نے پھر سوچا کہ اس کے مقالہ مدیری کی اردو میں چاہے اور کچھ ہو یا نہ
ہو لیکن بے ضرورت ۹۵ فیصدی انگریزی الفاظ ضرور ہوں گے، اور یہ کبھی نہ
ہوگا کہ حیدر آباد کے اخباروں کی طرح ہر انگریزی جملے، فقرے اور لفظ و اصطلاح
کے بدلے میں اردو کا جملہ فقرہ ہو کہ اس کے لئے اول تو خالص ہندوستانی ذوق
کی ضرورت ہے اور پھر اتنی فارسی عربی صلاحیت کی کہ بیساختہ اردو کے الفاظ
گھڑے جاسکیں، اسی لئے باوصف اردو کی سب سے بڑے خدمت گذار مشہور ہونے
کے پنجابی صحافت ہی نے اردو میں سب سے زائد انگریزی الفاظ کا ذخیرہ جمع
کر دیا ہے،

پھر میں نے سوچا کہ خیام کے عملہ ادارت میں ہر قابلیت کے لوگ ہوں یا نہ ہوں

لیکن ایک ظرافت نگار صاحب ضرور ہوں گے، جو بہرہ فکاہت کھولے ہر وقت خریداروں کو ہنسانے کی کوشش میں مبتلا ہونگے، اور ہاں یہ تو بھول ہی گیا کہ اس اخبار میں اگر تصاویر کا انتظام فی الوقت نہ ہوگا تو بھی سینما کے اشتہارات تو ضرور ہوں گے اور اُن میں کسی نہ کسی ایکٹرنی کی تصویر ہوگی،

الحاصل، یہ ایک ترچھی سی یا ہلکی سی غائبانہ نظر ہے، جو میں نے اسوقت ڈالی ہے جب صبح کے چار بج رہے ہیں اور ایک چھوڑ ۲ دو مریض ملیریا کے مارے ہوئے میری "لکھائی کی جگہ" کے قریب اس خوبصورتی سے کھانس رہے ہیں گویا کھانسی کے فن میں کمال کر کے دکھانے والے ہیں، اس لئے ان کی کھانسی کی جھنجلاہٹ میں اگر میرے اندازہ میں کوئی غلط بات نکل گئی ہو تو معافی کا خواستگار ہوں اور ویسے جی چاہے تو آپ بھی میرے خلاف دس مضامین لکھ دیجئے گا۔

اپنی ایک شاعری بھی روانہ کرتا ہوں، اس کو دوسری اشاعت میں چھاپ دیجئے گا، اور تھوڑی بہت تعریف بھی لکھ دیجئے گا، کیونکہ اگر میں اپنی غزل آپ کے منہ کے سامنے بیٹھ کر سناتا تو آپ تکلفاً بھی داد عطا فرماتے، لہذا اب لکھ کر ہی سہی ہاں اگر "جام" مجھے مل گیا تو انشاء اللہ اس پر حاضرانہ نظر بھی ڈالوں گا۔ والسلام۔

(۵)

ایڈیٹر صاحب "نگارستان" دہلی کے نام

محترم "مدیر نگارستان" دہلی!

بعد سلام مسنون آنکہ معلوم ہو کہ الحمد للہ تادم تحریر ہذا یہاں پر خیریت ہے، اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ اس طرف موسم خراب ہو رہا ہے، یعنی مدت مدید و عرصہ بعید سے یہاں بارش نہیں ہوئی ہے، جس سے دن میں گرمی شدید ہوتی ہے اور ذی ہوش لوگوں کو تکلیف مزید۔

مذہب کو سائنس پر ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ نماز اور دعا سے بارش ہو سکتی ہے اور نیاز مند کا خیال ہے کہ جب تک مان سون پیدا نہ ہوگی مر بھی جائیے تو بارش نہ ہوگی، اور مان سون کا قرآن پاک میں بھی تذکرہ ہے، ادھر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب انسان کے مظالم اور سیہ کاریاں ملک چین، حبشہ، ہسپانیہ، البانیہ سلوا کیا اور ڈینزگ تک پہنچ جاتی ہیں اور جمعیۃ الاقوام کا دوزخ ان کو جلاتا نہیں تو ایک بارش کیا جاڑا تک بند ہو جائیگا، اور ہم آپ لحافوں اور روئی کے

کپڑوں کی خرید کے عذاب سے بچ جائیں گے، مگر ہاں سچ فرمایا آپ نے کہ آپکو ان سیاسی باتوں سے کیا تعلق، آپ تو ٹھیرے فلمی آدمی، مگر اپنی تاریک خیالی سے میں سینما سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا، البتہ میری بیوی نمبر ۲ سینما بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، اور میں قرضدار ہوا چلا جا رہا ہوں، خیر تو دیگر احوال یہ ہے کہ خدا تندرستی دے بارش ہو یا نہ ہو، مضمون نگاری اور عشق بازی کا سلسلہ بند نہیں ہوگا ۔ بس ڈر ہے، تو قحط سالی کا، کیونکہ قحط سالی میں عشق بازی کے خلاف سعدی علیہ الرحمتہ کی یہ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہو جاتی ہے کہ ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق ✤ کہ یاراں فراموش کردند عشق

مگر میری رائے میں یہ سوال ہے جغرافیہ دانی کا، یعنی سعدی علیہ الرحمتہ نے قحط سالی میں عشق بازی بند ہونے کا واقعہ دمشق کے متعلق لکھا ہے اور ہم آپ ہیں الحمد للہ ہندوستان میں، اور ہندوستان میں اللہ میاں کا دیا سب کچھ ہے، صرف عقل سلیم ہی نہیں ہے، اسی لئے تو دیکھ لیجئے کہ ہر ہندوستانی کے مصارف اس کی آمدنی سے دوچند ہی نظر آتے ہیں، اسی طرح ہندوستان میں ہر کام وہ شخص کرتا ہے جو اس کام کا اہل نہیں ہوتا، دور نہ جائیے، ایڈیٹری ہی کا کام لے لیجئے، کہ اس پختہ کاری کام کو بھی ہندوستان کے ایسے نوخیز و نو عمر لڑکے چلا رہے ہیں جو آٹھویں نویں

جماعت سے تعلیم چھوڑ کر بھاگ آئے ہیں اور بعض پرچوں کے ادھر نہ اُدھر خالص چیف ایڈیٹر بنے ہوئے ہیں، ایسے نوخیز ایڈیٹروں کے ذریعہ زبان اُردو میں جو گندہ حیاسوز، بیکار اور خلاف عقل و فطرت ذخیرہ جمع ہو رہا ہے، اس پر آنیوالی نسل کے پختہ کار محرم سے زیادہ روئیں گے، مثلاً آپ آج کل کے رسالوں کے افسانوں ہی کو لے لیجئے کہ لکھے تو جاتے ہیں انبار در انبار، مگر ہوتے ہیں سب غلط، خلاف فطرت، اور خلاف واقعہ، ایسے افسانوں میں جو جذبات، واردات اور واقعات دکھائے جاتے ہیں، اُن سے ہندوستان کی معیاری شرافت، حیا اور خودداری پر جو ضرب لگ رہی ہے اور یہاں کے باوقار حُسن کی جیسی تحقیر ہو رہی ہے، یہ غضب نوعمرے افسانہ نگار کیا جانیں کہ ایسے گندہ، فحش اور دُور از حقیقت افسانوں سے ہندوستانی حُسن کے وقار کو کتنا صدمہ پہنچ رہا ہے!

دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا ملا، حال معلوم ہوا، یعنی وہ جو آپ نے میری نظم پر ایک ملاحظہ لکھا ہے، اسکی تعریف میں دُوسروں کے سبق کے لئے کرتا ہُوں، یعنی ہندوستان میں عقل سلیم کے کامل اور کثرت سے نہ ہونے کے نتائج بد زندگی کے ہر حصہ سے نمایاں ہیں، مثلاً ہندوستان کے باکمالوں کو دیکھئے اور ہندوستان کے قومی خدام کو ملاحظہ فرمائیے، جو محض قوم کی غفلت اور ناقدردانی سے تباہ ہیں

بعض اُلو کی قوم کے لوگ اور لگائیاں قدر کے معنی دولت کے سمجھتے ہیں، جی نہیں بلکہ قدر کے معنی داد اور حوصلہ بڑھانے کے ہیں، سو ہندوستانیوں میں یہ بھی نہیں البتہ وہ یورپ کے باکمالوں کو داد دیتے ہیں، پس ہندوستانیوں کی اسی تنگ دلی اور برادر فراموشی کا یہ اثر ہے کہ قومی خدام اور باکمال لوگ بھی اپنا کمال دکھلانے کے عوض بکرا بکری کی تجارت شروع کر دیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ایسی ناقدردان قوم کو اپنے کمال سے کیوں فائدہ پہنچائیں، جو الفاظ کے ذریعہ بھی دل بڑھانے میں کنجوس ہے، مگر آپ کے ملاحظہ سے ثابت ہوا کہ آپ خود باکمال ہیں اور نفسیات انسانی کے ماہر اور بڑے فیاض حوصلہ، اس لئے دوسروں کے کمال اور محنت کی داد دیتے ہیں،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ میں "نگارستان" میں اپنے مضامین کی بارش شروع کر دوں، تو التماس ہے کہ اوّل تو ویسے ہی موسم ہے قحط کا، دُوسرے جب مضمون نگاری کے بالکل بیچ میں ایک چھوڑ چار بیویاں پھاند پڑیں، تو مضمون نگار شوہر مضمون نگاری کے عوض اپنا سر تو پھوڑ لیگا، مگر مضمون نہ لکھ سکیگا، وہ تو بھائی جان یہ میری چھوٹی بیوی کی قدردانی کا صدقہ ہے جو آج میں شعر بھی کہہ رہا ہوں، ورنہ وہ اُوپر کی تین بیویوں نے تو

مجھے سینما کے خرچ ہی سے کہیں کا نہ رکھا تھا، ادھر قرض روپیہ لیکر مجھے ۲ دو سہولتیں حاصل ہیں، ایک تو یہ کہ جب تک قرض دینے والے کی جان ہی نہ جلنے لگے اس وقت تک میں لیا ہوا روپیہ واپس نہیں کرتا، دُوسرے یہ کہ اللہ کا دیا بیویوں کا جہیز کافی ہے، اسی لئے کہا کرتا ہُوں کہ ظالمو! شادی پر شادی کئے جاؤ، اور یہ انگریزی قاعدہ سے بات بات پر طلاق کی عادت ترک کردو،

اسی طرح اگر جہیز میں سسرال سے زیور، برتن اور روپیہ کے عوض اُونٹ ہی اُونٹ ملیں تو شکریہ کیساتھ قبول کرلو، مگر شادی سے انکار نہ کرو، آپ خود ہی سوچئے کہ دس ۱۰ بارہ ۱۲ اُونٹ فروخت کرکے ایک سینما گھر کھولا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

لہٰذا جب بیوی کے جہیز کے اُونٹوں سے سینما گھر جاری کردیا جائیگا تو قرض بھی ادا کردیا جائیگا، اور آمدنی بھی ہوگی، مگر مشکل تو یہ ہے کہ آجکل کے نوجوان تو محض دولتمند بیوی چاہتے ہیں اور وہ بھی خود مفلس اور قلاّش ہو کر، اور میرا تجربہ ہے کہ افلاس کے عالم میں نماز روزہ تک صحیح نہیں ہوتا، بیوی تو پھر دنیوی چیز ہے،

خیر تو کہنا یہ تھا کہ ذرا بیویوں کی مصروفیت سے فرصت پالوں تو انشاءاللہ نگارستان میں مضامین کی بارش تو کیا وہ طوفان اُٹھاؤں کہ دہلی بھر

"پانی روک نماز" پڑھنے پر مجبور ہو جائے، ورنہ اس وقت تک غزلوں سے تو چوکنا نہیں،

دیگر احوال یہ ہے کہ میں سینما میں تماشہ کرنیوالی لڑکیوں سے اتنا ہی واقف ہوں کہ وہ خوبصورت اور فینسی ہوتی ہیں، البتہ ان کے نماز روزہ کی عادت سے واقف نہیں، کیونکہ وہ مجھ سے دُور ہیں اور میں اُن سے دُور، ممکن ہے کہ بعض ان میں مذہبی ہوں اور بعض غیر مذہبی، پھر بھی سینما میں تماشہ کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں سے ملک کو یہ نقصان پہنچ رہا ہے کہ یہ دونوں غیر ہندوستانی لباس و غیر ہندوستانی اشیاء آرائش سے ملکی کپڑے اور ملکی وضع قطع کو بگاڑ رہے ہیں،

بھئی اگر یہ سینمائی لڑکیاں لونڈر کے عوض اپنے لکھنوی اصغر علی محمد علی صاحبان کی دکان کا عطر استعمال فرمائیں تو اس طرح ملکی صنعت کو ترقی ہو گی،

غرض ہر چیز میں جب تک "ملکی پن" اور "قومی پن" کا لحاظ نہ رکھا جائے گا اس وقت تک میں اور میری چھوٹی بیوی نہ سینما کا تماشہ دیکھیں گے نہ سینما پر کچھ لکھ سکیں گے،

اب تو یہ فرمائیے کہ آپ کی طرف کا موسم کیسا ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان

چونکہ بے ہُنری اور افلاس کا گھر ہے اس لئے اس میں بارش کے زمانہ میں بھی اگر خاک ہی اُڑتی رہے تو تعجب نہ کیجئے،

بھلا بے ہُنری سی بے ہنری ہے کہ لاکھوں نوجوان لڑکے محض بے ہنری کیوجہ سے بیویوں سے محروم ہیں اور لاکھوں لڑکیاں ہیں جو بے ہُنری کیوجہ سے اچھے شوہروں سے خالی، خیر سچ فرمایا آپ نے کہ ہم کو، آپکو اور لیڈروں کو قوم کی ایسی کمزوریوں سے کیا تعلق!

اچھا تو پھر مہربانی فرما کر اس طرف کا حال لکھئے اور خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام دعا یہ پہنچا کر کہدیجئے کہ انشا اللہ ملّا آموزی صاحب "نگارستان" میں لکھتے رہیں گے، زیادہ بجز دعا اور کیا کہا جائے، مکرر آنکہ اگر اس طرف گھی کا نرخ گر گیا ہو تو بواپسی ہذا!" جلد مطلع کیجئے گا، سہ مکرر آنکہ گھر میں جناب کو دعا کہتی ہیں، اگر جناب موصوفہ سے چھوٹے ہیں، اور جو بڑے ہیں تو سلام و آداب!

---

(۶)

ایڈیٹر اخبار "عصر جدید" کلکتہ کے نام

محترم مدیر "عصر جدید"! بعد سلام مسنون آنکہ گذارش ہے کہ خط آنجناب کا

شرف صدور لایا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا، الحمدللہ کہ یہاں بھی تادم تحریر ہذا ہر طرح خیریت ہے، صرف ذرا چیچک کا موسم تیز ہو گیا ہے جس سے کم عمر بچے ضائع ہو رہے ہیں، مگر خدا کا کرم کہ اتنے ہی پیدا بھی ہو رہے ہیں، لہٰذا اوسط برابر، جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو نہ خوشی اور نہ غم، البتہ خیریت اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب،

دیگر احوال یہ ہے کہ زمانہ ہے جنگ جرمنی کا اور ہم آپ اس سے پہلے کی جنگ عظیم میں بھی خاصے ہوشمند تھے اور اب تو الحمدللہ نخالص ہوشمند ہیں، فرق صرف یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں نیاز مند کے حبالہ عقد عرف نکاح میں صرف ایک، مولویوں کے مزاج سے ملتی جلتی بیوی تھی، جس سے میرے انگریزی کاموں میں قدرے رکاوٹ پیدا ہوتی تھی اس لئے وہ جو حضرت غالب نے فرمایا ہے کہ ؎

بیویاں چار جب نہ ہوں غالب ٭ تندرستی ہزار نعمت ہے

سو اس قاعدہ شعری سے میں نے تین کا اضافہ اور کر لیا، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس جنگ کے خاتمہ پر چار اور کرونگا، اب آپ سوال فرمائیں گے کہ آخر یہ بیویوں کی اتنی بڑی فیکٹری قائم فرمانے سے مجھ ناچیز کا کیا مطلب،

سو قصہ یہ ہے کہ میں ٹھیرا آدمی قومی، مصلح، حکیم الامت، لیڈر، رہبر، حاذق الملک اور آجکل کی اصطلاح میں ڈکٹیٹر، اس لئے میرے تجربات زندگی کل کے دن مجربات جالینوس اور سقراط کا کام دینگے، اس لئے میں نے طے کیا کہ معلوم کیا جائے کہ چار بیویوں کی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے یا چار شوہروں کی، مگر افسوس کہ چار شوہروں والی تحریک ابھی یورپ ہی میں چل رہی ہے، اور جنگ کیوجہ سے شاید ابھی کچھ دن اور یہ ہندوستان میں داخل نہ ہوسکے، مگر چار بیویوں کی تحریک ہندوستان میں بہت پرانی ہے، بلکہ امراء ہند میں تو سنا ہے کہ بہت سے چار سو بیویاں تک بہ یک وقت رکھنے کی تحریک بھی کامیاب ہوچکی ہے، اور لکھنؤ یا دہلی میں سنا ہے کہ ایسے مکانات اب بھی موجود ہیں جن میں اتنی بیویوں کے جلسے منعقد ہوتے رہتے تھے، آپ کے کلکتہ اور لاہور کا حال معلوم نہیں، قصہ کوتاہ جرمنی کی جنگ اور اٹلی کے حملۂ حبشہ کے وقت فوجی سپاہی بڑھانے کی معقول ضرورت کو بھی اگر کسی شوہر کے شامل حال کردیا جائے تو کثرت ازدواج کی ضرورت خوبصورت بھی نظر آتی ہے اور قومی خدمت بھی، البتہ میں ان شوہروں کا سخت مخالف ہوں جو "بیوی بغرض بیوی" نہیں بلکہ "بیوی بغرض زیور" کرتے ہیں یا "بیوی بغرض سینما"۔ بارے آپ یہ تو طے فرما ہی لیں گے کہ میں بیویوں کے بارے میں اتنا زیادہ

غلط کار نہیں ہو سکتا جتنا کہ بے علم لوگ سمجھ سکتے ہیں، مگر کافی خرد مندی استعمال کرنے پر بھی اور مواقع پر نہ سہی تو کم سے کم عید بقر عید کے موقع پر ضرور پتہ چل جاتا ہے کہ بیویوں کے معاملہ میں تھوڑی بہت کسر رہ گئی یا بُرا کیا جو چار کیں، یا یہ کہ شریف ہوں تو اب نہ کروں گا، یا کروں گا تو انگریزی داں نہ کروں گا، یا انگریزی داں کروں گا تو انگریزی داں سسرال سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا، یا پھر سرے سے غیر انگریزی داں بیوی کا نام بھی نہ لوں گا۔

غرض ہزاروں تجربات ہیں جو زیادہ بیویوں کے سلسلہ سے حاصل ہوتے ہیں اور خرچ صرف اتنا ہوتا ہے کہ شوہر حسین دماغ اور اعلیٰ درجہ کی نفسیاتی قابلیت کا ماہر ہو، سو الحمدللہ کہ آپ سب بھائی مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ نیاز مند شوہر عرف ملّا رموزی عورتوں کے نازک احساسات، ان کی واجبی ضروریات، اُن کے جدید اور فیشنی خیالات کا کتنا زبردست ماہر ہے، بعض اوقات تو مجھے اپنے لیے یہ شبہ ہوتا ہے گویا میں بھی جرمنی سے "بیویات" کی ڈگری لے کر آیا ہوں، اس زعم کا نتیجہ یہ ہے کہ میری بیویاں مجھ سے خوش اور میں اُن سے خوش، البتہ چاروں سُسرالوں کی خوشی کا نہ مجھے علم نہ میری بیویوں کو اس کی پروا،

اب وہ جو میں نے کہا ہے کہ بیوی یا بیویوں کے امتحان کا موقع یا تو وہ ہے

جب وہ بیس ۲۰ برس کی عمر تک کسی تقریب میں شرکت کیلئے اپنے شوہر سے کچھ طلب کریں، یا پھر ان کی کوئی سینما دیکھنے والی سہیلی ان کی دعوت پر ان کے گھر آئے، یا خود اُن کے بچے کی کوئی تقریب ہو، یا پھر عید، بقرعید، میں نے عمر کی قید بایں ۲۰ اس لئے لگادی ہے کہ اس وقت تک عقلی قویٰ کامل نہیں ہوتے، اس لئے ان مواقع پر شوہر زیادہ خطرہ میں رہتا ہے، البتہ بیس ۲۰ سے تیس ۳۰ تک کی عمر والی بیوی ان مواقع پر اپنے شعور کے موافق کام کرتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ اس عمر کی غیر انگریزی داں بیوی زیادہ خطرناک ہے یا خالص انگریزی داں؟ میری ناچیز رائے میں عید بقرعید کے لئے یہ غیر انگریزی داں بیوی نقصان دیتی نہ خالص انگریزی داں بلکہ خطرناک تو ہے وہ غریب جس نے آجکل کے انگریزی مدرسوں میں کلیم سات آٹھ درجوں تک کی انگریزی پڑھی ہو، اور ماں باپ کی دولتمندی، لاڈ پیار، اور خود مختاری کے ہاتھوں تعلیم چھوڑ بیٹھی ہو، یا اسی جگہ سے افسانہ نگار اور شاعرہ بن گئی ہو، پس اب یہ بیوی شوہر کے حق میں الامان بھی بن سکتی ہے اور الحفیظ بھی، اور اس پر سے ماں باپ بھی اگر یورپی زندگی کے نقال ہوں تب تو ع

نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن!

ایسی بیویوں کی خاص پہچان یہ ہے کہ اُن کے والد اور بھائی وغیرہ اپنا

اسلامی نام بھی اُردو میں یُوں لکھتے ہیں، مثلاً ایس ایم غفور، جی آئی پی آر قادر، ای آئی آر محی الدین، اور ایسی بیوی خود بھی اپنے دستخط اس طرح کرتی ہے، مثلاً بی بی سی آئی آر پروین، این ڈبلیو آر گلزار، اس قسم کی بیوی کے گھر اگر ریڈیو بھی ہو اور اس کے خاندان کا ایک آدھ مرد ولایت میں تعلیم پارہا ہو تب تو شوہر کی خیریت صرف گورنمنٹ کے قانون میں ہے، اب اگر ان حالات والی بیوی کے گھر عید بقرعید کا سوال آجائے اور اسکا ایک آدھ بچہ بھی ہو تو مان لیجئے کہ اب نہ ایک ولایتی دکان باقی رہیگی، نہ زیور، اور سینما کے تماشوں اور اعلی درجہ کے ولایتی فرنیچر کے مصارف،

اب ایسی بیوی اور مولوی وضع کی بیوی کے مصارف کا فرق صرف اتنا ہے کہ مولوی وضع بیوی کے بچے عموماً بے اندازہ ہوتے ہیں، لہذا عید کے مصارف بھی زیادہ، اور ریڈیو اور پیانو قسم کی بیوی کے اولاد کم اور بھاری فیشن کے مصارف گویا ایک بیوی کے اور چار بیویوں کے مصارف کچھ اس طرح جمع ہوجاتے ہیں کہ ایک بیوی والا بھی عید پر قرضدار نظر آتا ہے اور چار بیویوں والا بھی مقروض، اس لئے اگر بیویوں کو "نارمل حد" تک رکھا جائے تو قدرے عافیت سے گذرتی ہے، ورنہ رزق دینے والا تو خدا ہے،

میری بیویوں میں مذکورۂ بالا اقسام کا ہر نمونہ موجود ہے، البتہ بیوی ۳
میں خاص بات یہ ہے کہ یہ غریب بیشمار معاملات میں "غیر جانبدار" رہتی ہے
اس کا زیادہ زمانہ سسرال میں کٹتا ہے، یعنی اگر وہ اپنے ماں باپ کے گھر
رہتی ہے تو وہ میرے حق میں سسرال ہو جاتی ہے اور جو میرے غریب خانہ میں
رہتی ہے تو اس کے حق میں سسرال ہو جاتی ہے، اس طرح گویا وہ ہر وقت سسرال
ہی میں رہتی ہے، اس لئے عید اور بیوی کے تجربات میں اس مرتبہ یہ اضافہ ہوا
کہ بیوی کا جس حد تک تعلق ہے وہ شوہر کے لئے ہمیشہ جنت ہے، البتہ سسرال
کا وجود شوہر کے لئے بے حد خطرناک ہے، بشرطیکہ شوہر سسرال سے زیادہ
غریب ہو، مثلاً اگر کسی کی بیوی اپنے شوہر کے گھر کے عوض اپنے ماں باپ کے
گھر میں عید کا تہوار منائے تو اس کو عید سے کچھ دن پہلے اپنے شوہر سے اس
قسم کی گفتگو کرنا ہی پڑتی ہے کہ :۔

"ڈیڑھ سال میں تو آج جا رہی ہوں، اماں کو تو دیکھو کہ وہ ہر وقت تمہارے
اور بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتی ہی رہتی ہیں، اب میں جاؤں تو ان کے بچوں
کے لئے کچھ نہ لے جاؤں، خیر ان کے بچے تو میرے بہن بھائی ہیں لیکن وہ غفورا
خالہ کو کیا منہ دکھاؤں گی جو پڑوسن ہو کر حقیقی خالہ کا حق ادا کر رہی ہیں، اچھا

جلانے دیجئے اور محلّے کے بچّے مجھے بڑی آپا کہتے کہتے تھکتے ہیں، تو کیا آج تہوار پر بھی میں اُن کا سلام لیتی رہوں ؟"

بیوی کی اس نوع کی گفتگو میں کسی کسی جگہ شوہر کو بھی یُوں بولنا پڑتا ہے کہ

"بس بس رہنے دیجئے، یہاں تو یہ حال ہے کہ جنگ کی وجہ سے ہر چیز کا نرخ چہار گونہ زیادہ ہو گیا ہے، اگلا قرض ادا نہیں ہو سکا اور خیر یہ سب کچھ سہی مگر میں تو تمہاری فیشنی زندگی کے ہاتھوں ہلاک ہوا جاتا ہوں، حد یہ ہے کہ تم خود مسلمان کی بیٹی ہو اور مسلمان کی بیوی، مگر اپنے بچّوں کو سر سے پائوں تک انگریزوں کے بچّے بنا رکھا ہے، لباس دیکھو تو انگریزی، ان کی غذا دیکھو تو انگریزی، اُن کے کھلانے والی عورتیں دیکھو تو انگریزی، ان کی تعلیم و تربیت دیکھو تو انگریزی، حالانکہ ماں باپ ہر حال میں ہندوستانی، اچھا میں یہ بھی برداشت کر لیتا مگر مصیبت تو یہ ہے کہ تم نے ہندوستانی عورت ہو کر بھی جب اسی مہینہ میں اپنے لئے خالص انگریزی عورتوں کی طرح سلیپنگ سُوٹ تیار کرا لئے اور تین بھاری ساڑیاں خرید لیں تو اَب میں عید منانے کے لئے مزید روپیہ کہاں سے لاؤں، وہ موٹر پر لاٹری کا ٹکٹ جاری کر دینے پر بھی فروخت نہ ہوئی، ابھی اس کی فکر ہے ورنہ پھر سینما جانے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی اور طعنہ دو گی کہ اچھے تاریک خیال

شوہر سے سابقہ پڑا ہے جو کمبخت عورت کا سینمائی حق چھینتا ہے، ریڈیو کی مشین کا روپیہ الگ دینا ہے، ورنہ شام سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہوگی، انگریزی وضع کے برتن کم ہوگئے ہیں وہ پورے نہ کرونگا تو کہوگی کہ میں ایسے گھر میں سہیلیوں کو کیا دعوت دوں جس گھر میں آجکل کی ضرورت کے برتن تک نہ ہوں، حالانکہ یہ تمام دولت برباد کرنیوالی زندگی آپ نے صرف یورپ والوں سے چرائی ہے اگر خود ایجاد کرکے اختیار فرماتیں تو میں بھی فخر کرتا اور ہندوستان بھر میں تمہاری دھوم ہوتی، کہ ماشاءاللہ فلاں ہندوستان زادی نے اپنی دماغی قابلیت سے ایسی تہذیب، ایسا تمدن اور ایسا معاشرتی نظام ایجاد اور مرتب کیا جو ہندوستانیوں کی ملکی اور قومی خصوصیات فطری کے عین موافق ہے، میں ایسی بیوی پر کیا فخر کروں، جو سر سے پاؤں تک یورپی عورت کی نقال بنی رہے اور فخر کرے کہ میں بھی "ایڈوانس" لڑکی ہوں۔

اس حد تک کی گفتگو کے دو ہی نتیجے ہوتے ہیں، یا تو میاں بیوی عمر بھر کے لئے دو جانیں اور ایک قالب ہوجاتے ہیں یا پھر ان کا معاملہ بغیر قاضی و مفتی کے طے نہیں ہوتا، میری بیوی نمبر ۳ کی یہ صفت ہزار درجہ شکر و ستائش کی مستحق ہے کہ وہ یورپ گھوم آئی ہے، "پائنیر" اور "ٹائمس آف انڈیا" پڑھ لیتی ہے، مگر نمازی

پرہیزگار ہونے کے ساتھ ساتھ خالص ہندوستانی فطرت وعادت بنی رہتی ہے چھُری کانٹے سے کھانا جان کر بھی ہاتھوں ہی سے کھاتی ہے، اور ہندوستانی لباس کی عادی ہے، دولت کی قدر جانتی ہے اور خالص کھادی کے لباس میں بسر کرتی ہے، اس مرتبہ کی عید کے مصارف جو ایک جوشیلے دولتمند دُولہا دُلہن کے مصارف سے کسی طرح کم نہ تھے محض بیوی ؑ کی قابلیت سے بچ گئے۔ جو ممکن ہے کہ میرے ہی کسی آنیوالے نکاح اور ولیمہ میں صرف ہوں، اس بیوی نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے ہی مصارف پر جو تقریر کی وہ بے خلوص لیڈروں کی تقریر سے زیادہ اثر والی تقریر تھی، حالانکہ چارپائی پر بیٹھ کر تقریر کرنے سے بجز گاندھی جی کے تمام دُوسرے لیڈر ہچکچاتے ہیں، مثلاً بیوی نے تقریراً فرمایا کہ:۔

اُس بیوی کو میں بیوی ہی تسلیم نہیں کرتی جو ملّا رموزی ایسے خوش فکر شوہر کی جان پر قرض کی فکر کا بوجھ ڈالے،

وہ بیوی ہی نہیں جو عید کے مصارف کے نام پر قرضدار ہو جائے،

وہ بیوی ہی نہیں جو پورے سال میں عید کے مصارف کیلئے روپیہ جمع نہ کر سکے،

وہ بیوی ہی نہیں جو سنیما کا تماشہ تو دیکھے مگر قوم کی خدمت کے قابل نہ ہو، اور اس میں گھریلو اور قومی اصلاح و خدمت کی لیاقت نہ ہو۔

وہ بیوی ہی نہیں جو ریڈیو پر اپنا وقت برباد کرتی ہو اور اپنے گھر سے نکل کر شہر اور محلہ کی عورتوں کی اصلاح نہ کرتی ہو یا نہ کر سکتی ہو!

وہ بیوی ہی نہیں جو ہندوستانی نسل کی ہو کر یورپی وضع و قطع پر مرتی ہو،

وہ بیوی ہی نہیں جو علوم مذہب سے یکسر بیگانہ ہو اور انگریزی میں اپنا نام لکھتی ہو،

وہ بیوی نہیں جس کے اولاد کم اور مصارف زیادہ ہوں،

وہ بیوی ہی نہیں جو کرسمس بھی مناتی ہو اور عید بھی۔

البتہ بیوی وہ ہے جو ایک باوقار زندگی اور مشہور عزت کی مالک ہو، بیوی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنی دماغی قابلیت سے ایک قوم کی سردار اور بزرگ بن کر رہے، اور اس کا شوہر محض اس کی دماغی قابلیت کی وجہ سے اس کی بیوی بن کر رہے، نہ تو یہ اُس کا فرمانبردار، اور بالکل اسی طرح:-

وہ شوہر نہیں جو اپنی بیوی کو تنہا ولایت یا سینما جانے کی اجازت دے،

وہ شوہر نہیں جو خود غیر ملکی وضع و قطع اختیار کرے اور بیوی کو بھی اس غیر ملکی رنگ میں رنگ جانے دے،

وہ شوہر ہی نہیں جو بیوی کی خوشنودی کیلئے خود ہی بیوی بنا رہے،

وہ شوہر ہی نہیں جو بیوی کے صلاح مشورہ بغیر دُنیا میں جو چاہے کرتا رہے،

وہ شوہر ہی نہیں جو خود بیجا مصارف کا عادی ہو اور بیوی کے مصارف ادا کرنے کے عوض اسکو تقریروں اور نصیحتوں سے خوش کرنا چاہے،

الحاصل جب بیوی سے کی تقریر کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تو میں نے مناسب سمجھا کہ اس مرتبہ کی عید اسی بیوی کی صدارت میں مناؤں،

اب جناب کی جو رائے ہو مطلع فرمائیے، اور خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ عید مبارک۔

---

(۷)

ایڈیٹر اخبار "صبح دکن" حیدرآباد کے نام

جناب گرامی ایڈیٹر صاحب اخبار "صبح دکن" حیدرآباد دکن سلامت!

بعد ادائے آداب مسنون آنکہ معلوم ہو کہ الحمدللہ تادم تحریر ہذا یہاں پر ہر طرح خیریت ہے اور خیریت آں محترم کی مع خورد و کلاں کے درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب، دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا آیا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا، مگر آپ نے یہ نہ لکھا کہ یہ خط آپ نے بعد عرصۂ دراز

اور انتظار بسیار کے کیوں لکھا ؟ مگر ہاں سچ ہے کہ مصروفیت آں محترم کی شب و روز بہت ہے جس کا اعتراف اس طرف کے حکام عالیمقام کو بھی ہے اور لاریب کہ آپ اپنی خدمات مفوضہ اور کارہائے متعلقہ کو بکمال اہتمام اور مستعدی انجام دیتے ہیں، عرف بجا لاتے ہیں، اور کچھ شک نہیں کہ آپ کی مستعدی ویسے بھی لائق ثنا و ستایش تھی، اور آجکل اس لئے زیادہ سے زیادہ قابل شکر و تعریف ہے کہ مسلمانوں میں خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ۹۹ فیصدی مستعدی ہی مفقود نظر آتی ہے، اور کسی قوم یا جماعت سے مستعدی کا فنا ہو جانا اور اپنے اعمال و وظائف اور فرائض کی بجا آوری میں سُسست، کاہل، بے حوصلہ، بے پروا، غافل، اور بے خبر ہو جانا گویا اُس قوم میں طاعون، ہیضہ، اور کالے بخار کے پھیل جانے کے برابر ہے، اب سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں کاہلی، سُستی اور غفلت نے کیوں رواج پایا تو اس کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ بازاروں میں خالص گھی بہت کم فروخت ہوتا ہے اور موسموں میں اعتدال نہیں رہا، بلکہ اس کے اسباب بے شمار ہیں، اور ان کا اس جگہ مع تفصیل و حواشی بیان کرنا اسی وقت مناسب ہوتا جب میں آپ کے مطبع کے پاس ایک مطبع منشی نول کشور آنجہانی کے جانشینوں اور قائم مقاموں سے بھی قائم کرا لیتا، البتہ مسلمانوں میں کاہلی سُستی اور بے عملی کیفیت پیدا ہونے کے چند اسباب محض خورد و کلاں کی آگاہی کیلئے

آپ کو لکھتا ہوں، آپ سے ہوسکے تو آپ کسی مسجد میں جاکر مسلمانوں کو سنا دیجئے گا، اور مسجد والے اپنے اپنے خورد و کلاں کو سنا دینگے، کیونکہ معاملہ ہے خیر کا،

پس مسلمانوں میں ہر قسم کی برائی، خرابی، کمزوری، لغویت، بیہودگی، خصوصاً غیر مستعد کیفیت کا پہلا سبب "اسلامی جامعہ عامہ" کا فقدان ہے، یا یوں کہئے کہ ان میں مرکزی زندگی کا فقدان ہے، اور جب کوئی جماعت مرکزی زندگی سے دُور ہوجاتی ہے تو اسے لاکھ ہوائی جہازوں میں بھر کر آسمان کی طرف بلند کیجئے، وہ دُنیا میں بلند اور سرافراز نہیں ہوسکتی، یُوں کہنے کو بمبئی اور کلکتہ میں لوگ ۲۰ منزل والے مکانوں میں رہتے ہیں، جو ملّا رموزی کے مکان سے یقیناً بہت بلند ہیں اور اس کا ملّا رموزی کی بیوی کو غم بھی ہے اور افسوس بھی،

دُوسرا سبب جہاں تک مجھے سی آئی ڈی والوں نے بتایا ہے یہ ہے کہ مسلمانوں میں صحیح علوم اور کمالات کے حصول کا فقدان ہے، یعنی وہ علوم و کمالات کے حصول پر جس طرح حریص نہیں رہے اسی طرح وہ گورنمنٹ آف انڈیا کی امداد و سرپرستی کے بغیر ترقی کے لئے جفاکش اور پُرحوصلہ بھی نہیں رہے، اسی لئے میں نے نہایت عمدہ عینک سے انھیں ہر جگہ دیکھا ہے کہ یہ نوجوان ہوکر بھی "تعلیمی وظائف" کے لئے فدوی، کمترین، خاکپا، تابعدار، فرمانبردار، نیازمند، نیاز آگین،

نیاز کیش، دعاگو، نمک خوار، نمک پروردہ، غلامانِ غلام، خود کو لکھ لکھ کر درخواستیں دیتے پھرتے ہیں، اور بعض تو خود کو "کفش بردار" تک لکھ دیتے ہیں، مگر وظیفہ لئے بغیر محض اپنی ہمت، جفاکشی اور اولوالعزمی سے نہ تعلیم پانے پر تیار نہ صنعت وحرفت کیلئے مستعد، معنی یہ ہوئے کہ قوم کا مجموعی حوصلہ بمبئی کے چور بازار میں نیلام ہو چکا! یہاں تک کہ خود مجھ سے ایک دن گورنمنٹ بیٹھی قسمیں کھا کھا کر اور حلف اٹھا اٹھا کر کہہ رہی تھی کہ ملا صاحب اگر مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ امداد واعانت اور سرپرستی کی جتنی درخواستیں مسلمان نوجوانوں کی آتی ہیں، دنیا کی کسی ایک قوم کے نوجوانوں کی اتنی درخواستیں نہیں آتیں، پھر امداد طلبی اور زرطلبی کی ان درخواستوں کی عبارتوں کی ذلت، محتاجی، پستی اور بے چارگی کو علمی نقطۂ نظر سے کسی ڈاکٹر کے پاس بھیجکر تحلیل کرایا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم کے مجموعی حوصلہ کیساتھ قوم کی غیرت اور خودداری کا خون بھی سرد ہو چکا،

چوتھا سبب نئے اور پرانے آداب واصول زندگی کا آپس میں ٹکرانا ہے، یعنی بدقسمتی سے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد بھی جو بزرگ باقی رہ گئے تھے ان میں سے بعض نے اور بعض نے نہیں تو کل نے اور کل نے نہیں جو جتنے آپ کو یاد ہوں اور جتنے مجھے یاد ہوں انہوں نے مسلمانوں کو جو کچھ سکھایا، سمجھایا، پڑھایا، اس

میں یہ بھی یقین دلایا کہ مسلمان کے لئے دُنیا دوزخ ہے اور عقبیٰ جنت، لہٰذا اُسے دُنیا میں ایک ہی کام کرنا چاہئے، یعنی قدم قدم پر شکر ادا کرے، اور جو کچھ اور جتنا مل جائے اسے بھی دوسروں کو تقسیم کرکے کھائے اور اُوپر سے پھر ایک شکر بجا لائے، اور خود کو ہمیشہ گنہگار، بے کار، ناکارہ، بیچارہ، اور حقیر فقیر کمترین سمجھتا ہے، اور جہاں تک ہو سکے بزرگوں کو جُھک کر سلام کرتا ہے،

یہ وہ آداب زندگی ہیں جو بدقسمتی سے یورپ کی اقوام کے ایسے آداب زندگی سے ٹکرا گئے، جن کے ہاں دوستانہ خط و کتابت تک میں خود کو ذرہ ناچیز، کمترین اور ہیچمدان لکھنا خودداری اور عالی حوصلگی کی توہین ہے، اسی لئے میں نے سُنا ہے کہ یورپ والے اپنی ہر قسم کی تحریر میں اپنے نام کیساتھ صرف ایک ہی لفظ لکھتے ہیں اور وہ بھی ایسا جس سے انکسار، عاجزی پستی اور بے حوصلگی کی بُو تک نہیں آتی، لیکن اپنے ہاں کے آداب میں غریب بیوی تک خود کو کنیز اور خادمہ لکھتی ہے، تو پھر جس قوم کے آداب والقاب تک میں پستی اور بے حوصلگی موجود ہو، اس قوم سے مستعدی کا مطالبہ کرنا ہی غلط، اور یہ آپ ضرور مانتے ہیں کہ الفاظ اور آداب کا اثر انسان کے خواص پر ضرور ہوتا ہے، جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی والے "الفاظ کا اثر خواص پر" والے لیکچروں کو لالٹین کے ذریعہ دکھایا کرتے ہیں، وہ تو خدا کا کرم ہے کہ اخبار اور رسالہ والے

مجھے ضیاء الملک لکھنے لگے، ورنہ میں خود پہلے اپنے آپکو خاکسار لکھا کرتا تھا،

پانچواں سبب ہندوستانی مسلمانوں کے بے عمل اور غیر مستعد ہونے کا یہ ہے اور اس سے میری بیوی کو بھی اتفاق ہے کہ ہندوستان میں مذہب اسلام کے نام سے بے شمار غلط تر کتابیں، وعظ، بیانات، روایات اور رسوم کو رواج دیا گیا جنہیں اصل اسلام سے دُور کا بھی تعلق نہیں، اور طرفہ مصیبت یہ کہ یہ خطرناک اور عقائد وخیالات کو کچھ سے کچھ بنا دینے والا سلسلہ اس روشنی اور بیداری کے زمانہ میں بھی باقی وجاری ہے، اور سی آئی ڈی والوں کو خبر تک نہیں، بس وہ تو مُلّا ہوزی کی رپٹ لکھاتے پھرتے ہیں، یعنی غلط تعلیم سے غلط خواص پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا روایات وعقائد جب غلط، تو شوہر بھی غلط اور بیوی بھی غلط،

چھٹا سبب مسلمانوں کے غیر مستعد ہونے کا یہ ہے اور اس سے تمام یورپین حکومتوں کو اتفاق ہے کہ جب یہاں کا مسلمان ملازمت اور تجارت وغیرہ کے لئے انگریزی سیکھنے پر مجبور ہوا تو آپ ہی بتلائیے کہ وہ بی اے پاس کرتا یا حقائق مذہب و نکات اسلام سے لبریز کتابوں کا مطالعہ کرتا، پھر طرفہ مصیبت یہ کہ دونوں کی زبان غیر، یعنی مذہبی تعلیمات کے لئے پہلے عربی پڑھیئے، اور انگریزی علوم کے لئے پہلے انگریزی، وہ تو جناب ایک آپ ہی کا نصیب اور مقدر سکندر نکلا کہ قدر قدرت سلیمان شوکت

اعلیٰ حضرت تاجدار دکن میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہ نے عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم مادری و ملکی زبان کو قرار دیکر "تاریخ ترقی ہند" میں ایک کبھی نہ مٹنے والا باب قائم کرلیا، ورنہ جانے اور دیکھ لیجئے کہ ہر جگہ مذہب اسلام کا نصاب تعلیم عربی میں ہے، اور بی اے کا انگریزی میں، اور میری عزیز از جان بیوی کے بی اے پاس نہ ہونے کا بڑا سبب یہی ہے کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے،

لہٰذا جب مسلمان بی اے کے لالچ میں پھنس گیا تو مذہب اسلام کے دُنیا جہان سے بہتر و برتر اصول زندگی سے وہ اتنا ہی واقف ہونے لگا کہ اپنی چھوٹی اور بے عقل اولاد کو بچپن میں روزے نماز کے مسائل پڑھا کر خوش ہو گیا کہ اولاد "دینیات" سے واقف ہو گئی، اور جب اولاد عقل، زندگی اور ترقی کے اہم راز اور نکات سمجھنے کے قابل ہوئی تو اُسے پی ایچ ڈی بنانے کے لئے جرمنی بھیجا جانے لگا، ورنہ آپ ہی بتلائیے کہ جس قوم میں روزانہ پانچ وقت نماز با جماعت ایسا عمل فریضہ قرار دیا گیا ہو اس سے زیادہ جفاکش، محنتی اور مستعد قوم اور کون ہو سکتی ہے؟ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ صرف تعلیمات اسلام کے ان ترقی بخش رازوں کو بی اے کی مصروفیت کے باعث نہ سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اس درجہ مستعد بنانیوالے فریضۂ نماز سے آج مساجد اگر آباد ہیں تو صرف کنجڑوں، جلاہوں، کسانوں، حمالوں،

حجاموں اور غریبوں عرف مزدوروں سے، اور دولتمند تاجر، تعلیم یافتہ اور ذی مقدرت
مسلمان ہیں کہ اپنی کوٹھیوں، بنگلوں، اٹاریوں اور دولتخانوں میں بیٹھے تاش کھیلا
کرتے ہیں، تو پھر جس قوم کے ذی مقدرت اور ذی ہوش افراد نماز باجماعت ایسے
مستعد تر بنانے والے فریضہ سے یوں جی چراتے ہوں، اس قوم میں مستعدی پیدا ہوگی
یا اس انگریز قوم میں جس کی عورتیں تک ہوائی جہاز چلاتی ہیں، مگر نہ خطرہ سے
ڈرتی ہیں نہ محنت سے جی چراتی ہیں،

پس مذہب اسلام کی اہم تعلیمات سے گریز کر کے جو مسلمان بے حوصلہ، بے ہمت
اور عیش پسند بنے ہیں اسکا سبب وہی ہے یعنی مرکزی زندگی کا فقدان، یعنی جب
تک اصحاب مقدرت بانس بریلی کے لٹھ کے ذریعہ اسلامی اصول و احکام کی پابندی
نہ کرائیں گے مسلمانوں کو کیا خوف ہوگا جو مغرب کی نماز ٹھنڈی سڑک کی تفریح
چھوڑ کر ادا کرنے پھرینگے، مگر جناب ایک آپ کی خادمہ نہیں نہیں آپ کی بچی
یعنی میری بیوی ہے جو میرے پانچ برس کے ولی عہد کو ابھی سے مذہبی باتیں سکھا
سکھا کر، سنا سنا کر، بتا بتا کر اور سمجھا سمجھا کر مارے ڈالتی ہے، یہاں "مارے ڈالتی"
سے مطلب یہ ہے کہ بہت زیادہ سکھاتی ہے،

مگر لاحول ولاقوۃ دیکھئے مارے زکام کے جو میرا دماغ خراب ہے تو میں خط

میں کیا لکھنا چاہتا تھا اور کیا لکھ گیا، لہٰذا یہ تو بتلائیے کہ آپ کے ہاں کی بارش اور فصل کا کیا حال ہے، اور آپ نے اپنی زمین کا کیا بندوبست کیا ہے، بھئی مجھ سے کیا دریافت کرتے ہو میں تو مسلمان قوم کا مضمون نگار ہوں، اس لئے مجھے نہ کسی نے جاگیر میں زمین دی نہ معافی میں کھیت، اس لئے میں کیا بتاؤں کہ یہ بارش فصل کے لئے کیسی ہے، میں تو اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ الحمدللہ اس بارش سے بلیریا اور انفلوانزہ خاصا ترقی کر رہا ہے، اور میں ہوں کہ دواؤں اور حکیموں کی فیس ادا کرتے کرتے مرا جا رہا ہوں، ہاں اگر ہندوؤں کے لئے ایسی زندگی، خوشی اور حکمت پیدا کرنے والی مضمون نگاری کرونگا تو اُن کے ہاں کے ایک مسٹر برلا ہی مجھے اتنی جاگیر و بدینگے کہ میں آپ کو دس لاکھ ایکڑ زمین کے تجربات بتا دیا کرونگا، بشرطیکہ آپ سی آئی ڈی والوں کو میرے تجربات نہ بتا دیا کریں، البتہ مواشی کے متعلق اتنا تجربہ ضرور ہے کہ انسان اگر مواشی سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو تو اُسے چاہئے کہ بارش کے موسم میں کافی تعداد میں "مرغا مرغی" پال لے، اسکا پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ بارش میں گھر میں کثرت سے مرغا مرغی ہونے سے بدمزاج اور لڑاکا بیوی کا مزاج رات کو ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور شوہر پر نازل ہونے والا غصہ دن بھر مرغا مرغیوں پر چلانے اور بھگانے میں خرچ ہو جاتا ہے، اس لئے ملازمت سے

تھکا ہوا شوہر رات بھر سکون سے سوتا ہے، کیونکہ بیوی کو ملٹے مرغا مرغیوں کے شوہر پر غصہ کرنے کی فرصت ہی نصیب نہیں ہوتی، اور ویسے آپ کی مرضی چاہیں تو آپ اونٹ پال لیں، کیونکہ مسلمانوں کے غیر مستعد ہونیکا ساتواں سبب یہ ہے کہ انہوں نے غلام اور مفتوح ہو کر آزاد اور فاتح اقوام کی نقل و تقلید شروع کردی، بھلا یہ بھی کوئی خردمندی اور زیرکی ہے کہ انگریز بھائی بڑی تجارت اور بھاری تنخواہ کے ذریعہ ریشم کا سوٹ پہنتا ہے لیکن مسلمان نہ آزاد ہے نہ فاتح نہ تاجر اعظم ہے نہ بھاری تنخواہ والا، لیکن وہ بھی ہے کہ ریشم کا سوٹ ڈاٹے آپ پر بھی دندناتا ہے اور مجھ پر بھی، اور تو اور سنا ہے کہ اب تو مسلمانوں کی ۵۰ فیصدی عورت ذاتیں ہیں کہ یورپی وضع و قطع اختیار کرتی جاتی ہیں، اب اگر ریاضی کا یہ سوال عثمانیہ یونیورسٹی کے اُستادوں کو دیدیا جائے اور دریافت کیا جائے کہ کیوں بھئی استادو بتاؤ تو کہ دو قوموں کا لباس اور تمدن تو ایک ہے، لیکن مالی حیثیت میں ایک زیادہ اور دوسری کم تو حاصل ضرب یہ نکلے گا، کہ مسلمانوں کی کمر اس خوبصورتی سے ٹوٹ کر رہ جائیگی کہ نہ اسے ڈاکٹر انصاری صاحب جوڑ سکیں گے نہ ڈاکٹر بوس، پھر جب قوم کی مالی حالت افسردہ اور پست ہوگی ڈاکٹروں سے رائے لے لیجئے کہ اس قوم کی دماغی حالت بھی

افسردہ اور پست ہوگی، اور جب دماغی حالت افسردہ ہوگی تو میری بیوی کی یہ رائے
صحیح ہوگی کہ مفلس قوم ہمیشہ بے حوصلہ اور غیر مستعد ہوتی ہے،
دیگر احوال یہ ہے کہ اب تو سُنا ہے کہ مسلمان مکانات بھی یورپ کی وضع کے
بنواتے ہیں، لہذا جب مکان یورپ کی وضع کا ہوا تو اسکی آرائیش کا سامان
بھی یورپ ہی سے آئیگا، اور جب زندگی کی ہر چیز یورپ سے آئیگی تو ملک
کی دولت ملک میں رہیگی یا یورپ جائیگی، پس جب گھر کی دولت یورپ
جائیگی تو گھر میں فراغت کے عوض فاقہ رہنے لگے گا، اور جب ملک میں فاقہ
رہیگا تو قوم میں انگڑائیاں، جمائیاں، اور غنودگی پیدا ہوگی یا مستعدی؟
اور ہاں بھائی جان وہ خوب یاد آئی اور وہ بھی ایک مولوی صورت کے
سی آئی ڈی نے یاد دلائی کہ بعض ذی مقدرت مسلمان اس نخرہ اور اطمینان
سے شراب بھی نوش فرماتے ہیں، گویا ہندوستان سے لے کر جرمنی تک انہیں
کا قبضہ ہے، لہذا نوش کیجئے قسم اوّل کی شراب،
پس جن دماغوں پر شراب مسلط ہو اور وہ بھی قدرے مذہب اور
جماعت کا خوف اور ندامت لئے تو ایسے افراد میں مستعدی کے عوض بزدلی
پیدا ہوتی ہے، آپ چاہیں جہاں کے کوتوال صاحب سے دریافت کرلیں،

کہ چوری کے ہر عمل کا اثر غواص و حواس کو بزدل یعنی کمزور بناتا ہے، لہٰذا مسلمان لاکھ دہریہ ہو کر بھی جب "شراب کھائیگا" تو اس کے دل و دماغ پر ندامت اور خوف کی ایک لرزش ضرور باقی رہیگی، لہٰذا شراب اُسے وہ نفع کبھی نہ دیگی جو بلار موزی کو، نہیں نہیں انگریزوں، فرانسیسیوں اور جرمنی کو دیتی ہے، جن کے ہاں شراب پیتے وقت نہ مذہب کا خوف ہوتا نہ جماعت کا، مگر ہاں آپ نے اپنے خط میں یہ نہ بتایا کہ آپ کے ہاں چاول اور ماش کی دال کا کیا نرخ ہے؟ مگر ہاں سچ فرماتے ہیں آپ کہ مسلمانوں میں جب تجارت کا ذوق بھی نہیں تو ان چیزوں کا نرخ کس طرح معلوم کیا جائے، بے شبہ مسلمان تو گھر بیٹھے جاگیر یا پھر ملازمت پر مرتا ہے، اچھا تو پھر یہ ہی بتایئے کہ اس طرف دیسی اور قدیم ورزش سے زیادہ دلچسپی ہے، یا یورپی ورزش کو پسند کیا جاتا ہے؟ میری اور دواخانہ یونانی دہلی کی یہ رائے ہے کہ ہندوستان گرم ملک ہے اس کے باشندوں کے لئے مشقت شاقہ ہمیشہ مضر اور مہلک ثابت ہوگی اور ہاکی فٹ بال اور کرکٹ کے کھیل یقیناً محنت شاقہ ہیں، جنہیں ہندوستانیوں کا دھوپ اور گرمی سے مارا ہوا جسم کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا، اور نہ عملاً میں نے کسی شخص کی عمر اور توانائی کو سو برس تک اس لئے محفوظ اور دراز دیکھا کہ وہ ہاکی یا فٹ بال کھیلتا تھا، بلکہ ان نوجوانوں کو بجائے توانا اور تندرست دیکھنے کے میں ہر وقت ٹینچر لگاتے

دیکھا کرتا ہوں اور سینما کے نقصانات کا تو تذکرہ ہی نہ کیجئے، بڑی بدنصیبی تو یہ ہے کہ غلامی کے عہد میں ذہن و دماغ چونکہ ماؤف، مسخ اور مفلوج ہوتا ہے، لہٰذا یورپ کی ہر چیز کو قبول اور اختیار کرتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہب آداب، اخلاق، معاشرت، آب و ہوا اور طبعی خواص کے موافق بھی ہے یا نہیں، بس جس طرح اور جس رنگ سے یورپ کی چیز جہاز سے اُترتی ہے اسی طرح بغیر کسی غور اور اصلاح کے ہندوستانی قبول فرما لیتے ہیں،

بھلا اُردو کے ان رسالوں کو بھی علمی و ادبی رسالے کہا جا سکتا ہے جو صرف سینما میں کام کرنے والی عورتوں کی تصاویر شائع کرتے ہیں، اور وہ بھی لے دیکر سینما کی تین چار عورتیں ہیں، جنہیں سو سو مرتبہ اور سو سو طرح سے یہ بے علم رسالے شائع کرتے رہتے ہیں، پھر جن رسالوں کا تصویری معیار یہ ہو خدا کے لئے گورنمنٹ سے مشورہ کرکے ذرا بتلائیے کہ اس قوم میں ترقی کی رُوح کس طرح بیدار ہوگی، یہ ہی حال اُردو کے "ادب لطیف" کا ہے، ابھی اتنا بڑا ساون کا مہینہ نکل گیا آپ اُردو کے تمام رسالے جمع کرکے دیکھ لیجئے زیادہ سے زیادہ چار چھ پُرانی نظمیں ہونگی جو ساون کی شباب اور جوانی میں ڈوبی ہوئی بہاروں پر شائع ہوئی ہونگی، سو وہ بھی سب کی سب مردوں کے قلم کی، حالانکہ یہ ہی وہ موسم ہے جب شباب والے شراب اور حُسن والے رنگ بن جایا

کرتے ہیں، زمین کی وسعتیں ہوتی ہیں جو حُسن و شادابی اور رنگ و خوشبو کے بھر سے جوان بنا دینے والے خزانے لٹاتی ہیں، حُسن و جوانی والوں کے دلوں میں ارمان اور آرزو ایک میٹھا درد بن جاتا ہے اور بارش کی مستیوں میں ڈوبی ہوئی ہوائیں جب انھیں گدگداتی ہیں تو وہ رسالوں میں فرضی شوہروں کے نام مضامین لکھتی ہیں اور چوری سے مُلّا رموزی کے نام خط، مگر آپ نے دیکھا کہ بے چینی، بے تابی، بے قراری، بے حجابی، بے اختیاری اور بے خودی کا یہ موسم اس طرح نکل گیا گویا یہ بھی عالمگیر جنگ ختم ہونے کی تاریخ تھی کہ تمام دُنیا اس کے احترام میں دو منٹ تک دم بخود کھڑی رہی اور ریل گاڑیاں بھی بند رہیں، تو پھر جس قوم میں غیر مستعد، بے دل، بے حوصلہ، بے ہمت، بے عمل اور بے دم رہنے کے اتنے اسباب ہوں اس میں آپ کا اتنے رنگین سالنامے شائع کرتے رہنا بس یوں کہیے کہ حیدرآباد کی سرزمین ہی کی اولوالعزمی ہے اور شاہ دکن کا زندگی بخش پرتو،

دیگر احوال یہ ہے کہ عثمانیہ یونیورسٹی والوں سے ملاقات ہو تو میرا بہت بہت سلام کہیے گا اور کہیے گا۔ کہ ملّا رموزی آپ کو بہت یاد کرتا ہے اور اُن سے یہ بھی دریافت کیجیے گا کہ اس خالص ملکی اور وطنی زبان والی درسگاہ میں اُستاد یورپ کا لباس پہنکر تو نہیں جاتے، اگر خدانخواستہ جاتے ہوں تو اُن سے علیحدہ بلا کر

کان میں کہدیجئے گا کہ یہ عمل اصولاً غلط ہے، اور بس، اور بھئی اگر دیکھو کہ وہ میری اس بات سے خفا ہوتے ہیں تو فوراً الفاظ واپس لے لیجئے گا،

امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے، ہاں طلبہ بھی اگر دیسی وضع کا لباس استعمال کریں تو اُن کا سراسر فائدہ ہی ہے اور ویسے وہ اُستاد اور طلبہ ہیں، اور ہیں فرمانبردار مگر آپ نے یہ نہ بتایا کہ آپ کے یہاں یورپ کے سگار اور سگریٹوں پر سالانہ کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے؟ باقی سب طرح خیریت ہے، اس مہینہ کے لئے تو انشاء اللہ گھی اور چاول کافی ہیں، اور ویسے اگر خالص گھی مل جائے اور آپ خود بازار جاکر اور خود نرخ طے کرکے لائیں تو ایک ٹین اپنے ہمراہ لیتے آئیے گا، معاف کیجئے مجھے آجکل کے ملازم اور خانساماں وغیرہ پر بھروسہ نہیں، حالانکہ آج کل کے فیشن ایبل لوگ جاہل اور نوجوان ملازموں اور خدام پر بعض اوقات اتنا بھروسہ کرتے ہیں کہ پورا گھر اُن کے سپرد کرکے چلے جاتے ہیں، اور نتائج کو ہم آپ اخباروں میں پڑھا کرتے ہیں، جی بالکل غلط ہے کہ میرے زکام اور ملیریا میں مبتلا ہونے پر کسی نے مجھے خفیہ خط لکھا تھا، آپ کے بھتیجے عرف میرے لڑکے کا سلام قبول ہو، کبھی کبھی تو اپنی اور قبلہ مولوی عبدالحق صاحب کی خیریت لکھدیا کیجئے، خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام اور ہاں وہ بھی آداب عرض کرتی ہیں اور بچوں کو دعا کہتی ہیں، زیادہ حد ادب -

(۸)

ایڈیٹر صاحب "ہمدرد صحت" دہلی کے نام

"ہمدرد صحت" کے محترم ناظرین و ناظرات کو بعد سلام مسنون اور شوق ملاقات کے اگر ملاقات ممکن ہو سکے تو معلوم ہو کہ الحمد للہ تا دم تحریر ہذا یہاں ہر طرح تو نہیں مگر ہاں زیادہ مقدار میں خیریت ہے، اور خیر و عافیت آپ سب کی درگاہ خداوند کریم سے شب و روز نیک چاہتا ہوں، حالانکہ یہ جھوٹ ہے اس لئے کہ یہاں اپنی ہی فکروں اور بیوی نمبر ۲ کی جدائی اور بے مروتی کے غم سے کسے فرصت!

دیگر احوال یہ ہے کہ ۲۸۔ فروری یا بھائی خدا معاف کرے ۲۹۔ فروری مگر سنا ہے کہ ۲۹ فروری کو ایک مارچ ہوا کرتی ہے تو خیر ایک مارچ ۱۹۳۵ء کی صبح کو، مگر صبح کو کیوں اچھے خاصے بجے ہوں گے کوئی دس' سوا دس' کہ میں جمعیۃ علمائے ہند کے مہمان خانہ سے اٹھا، اور قبلہ محترم حکیم حاذق حاجی مولوی عبد الحمید صاحب مالک "ہمدرد دواخانہ دہلی" و ایڈیٹر رسالہ "ہمدرد صحت دہلی" کی ملاقات کے لئے ممدوح کے دواخانہ پر گیا اور یہاں سے ممدوح کے کمرہ تک اس طرح پہنچا گویا کوئی کسان ہندوستان کے وائسرائے کی جمال اندر جمال کوٹھی میں گھس گیا ہو اور گھبرا رہا ہو، وہ تو بال بال بچ گیا

ورنہ ممدوح کے دروازہ کے باہر ایک مشینوں کے کارخانہ میں گھس گیا ہوتا کہ اسے اپنی خرد مندی سے میں "مطبع ہمدرد صحت" سمجھ بیٹھا تھا، غرض خدا خدا کر کے ہمدرد دواخانہ کی عمارت میں داخل ہوا اور پھر گھبرانے لگا اس حد تک کہ بار بار واپس ہو جانے کو جی چاہتا تھا، اب یہ گھبراہٹ محض اس وجہ سے تھی کہ خدا کو حاضر ناظر جان کر یعنی بحلف مذہبی کہتا ہوں کہ میں نے آج تک ہندوستانی طب کا اتنا عظیم الشان، نفیس، مرتب، مزین، مفرح اور رنگین دواخانہ نہیں دیکھا، یہاں دواخانہ سے مراد وہ شربت نیلوفر، عرق گاؤزبان، خمیرہ گاؤزبان، اور حب مقوی باہ کی وہ رنگین اور نفیس بوتلیں اور شیشیاں نہیں ہیں جو عطاروں اور حکیموں کی دکانوں اور دواخانوں میں خریداروں کی نظریں کھینچنے کے لئے برابر برابر رکھی جاتی ہیں، بلکہ یہاں تو ستم یہ تھا کہ یہ ادویہ کا وہ عظیم الشان ذخیرہ تھا جو لاکھوں طبی اصول و ضوابط کے ذریعہ تیار ہو کر مریضوں تک اللہ کافی اللہ شافی کہکر پہنچایا جاتا ہے، اور یقیناً قسمت کے مارے ہوئے ہیں وہ ہندوستانی عطار جو ہمدرد دواخانہ سے اپنی دکان کے لئے دوائیں نہیں خریدتے، کہ بھلا اس ذخیرہ کے رکھنے رچانے، بنانے اور روانہ کرنے کی جگہ جب اتنی حسین و دلفریب ہو کہ ملا رموزی ایسا بادشاہوں کے محلات کو خاطر میں نہ لانے والا انسان اس کوٹھی کی صفائی اور ترتیب کے حسن سے

مبہوت ہو کر رہ جائے تو بھاڑ ہی جھونکتے رہیں گے وہ عطار جو اس دواخانہ سے دوا ولس کا ذخیرہ نہ خریدیں گے یا اس ذخیرے پر کوئی اعتراض کرینگے،

القصہ دریافت کرتا کرتا، ڈرتا اور بدتمیزوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتا ہوا اس عمارت کی بالائی منزل پر ایک صاحب کی رہنمائی سے چڑھا، اُوپر پہنچا تو اس منزل کی صفائی، چمک دمک اور زرق برق سی حالت کو دیکھ کر پھر سہم سا گیا اور سوچا کہ کہیں کوئی سی آئی ڈی والا تو پیچھے نہیں لگا ہوا ہے جو مجھے دواخانہ کہکر کسی بڑے رئیس کی کوٹھی میں بھیج رہا ہے تاکہ پکڑا جاؤں اور عدالت سے سزا پا جاؤں؟

مگر دل کو یہ کہکر ہمت دی کہ لاحول ولا تلا رموزی آخر تو قبلۂ محترم حکیم مسیح الملک محمد اجمل خاں مغفور سے لیکر قبلۂ محترم حکیم محمد احمد خاں صاحب اور قبلۂ محترم ارسطوئے ہند حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا اور قبلۂ محترم حکیم عبدالحئی انصاری ایسے جلیل القدر حکماء کی کوٹھیوں میں بھی جب جاتا آتا رہتا ہے اور الحمد للہ کہ آجتک ان کوٹھیوں سے نکالا نہ گیا تو بڑھ خدا کا نام لے کر، انشاءاللہ اس کوٹھی سے بھی تجھے شربت ہی شربت ملیں گے، بس یہ سوچنا تھا کہ ناگاہ خود کو ایک ایسے کمرہ میں پایا جسے اس کی لطافت، رنگینی، تجمّل، صفائی اور حسن وتہذیب کے لحاظ سے اگر اس دواخانہ کو "نقش رنگین و نگارخانہ" کہتیں تو غلط نہیں، یعنی یہ کمرہ جناب محترم

حکیم حاجی عبدالحمید صاحب ایڈیٹر رسالہ "ہمدرد صحت" کا کمرہ تھا جسے طبی محاورے میں مطب بھی کہتے ہیں، چونکہ میری فطرت میں بالکل تو نہیں مگر ہاں کبھی کبھی جو صاف لکھ جانے اور کہہ گذرنے کے جراثیم شامل ہیں تو میں کہتا ہوں کہ اس درجہ حسین و رنگین کمرہ میں بیٹھ کر دق اور سل اور دمہ وغیرہ ایسے مکروہ امراض کے مریضوں کا علاج کرنا کمرہ کی نہیں تو اس کی لطافتوں اور نفاستوں کی توہین ضرور ہے، البتہ اس کمرہ کو ایڈیٹری کے لئے خاص کر دینا تو ذہن و دماغ اور فن انشار کی قدر دانی ہے لیکن کھانستے ہوئے اور ہانپتے ہوئے مریضوں کا اس کمرہ میں داخل ہونا کسی طرح مناسب ہے نہ موزوں، اور جو اس پر بھی یہ کمرہ مطب ہی بنا رہا تو سمجھوں گا کہ حسن کی قسمت اور نصیب ہی میں لکھا ہے کہ وہ تاریکی اور گندگی سے وابستہ اور متعلق رہے، اسی لئے دیکھ لیجئے کہ امیروں کی اولاد ہمیشہ موٹر ڈرائیوروں اور خدمت گاروں ہی سے خوش رہتی ہے، اور رشتہ داروں سے اسی بہانے سے دور رہتی ہے کہ کہیں وہ اخباروں میں نہ لکھ دیں، مگر اس درجہ حسین کمرہ کو غربا، کا مطب بنا دیا گیا محترم حکیم صاحب کا وہ خلق رنگین اور اسلامی مساوات اور غریب نوازی کا وہ لائق احترام عمل نہیں جس سے آج ۹۹ فیصدی مسلمان امراء اور دولتمند محروم اور دور ہیں، کیا دولتمند مسلمانوں میں غربا سے اس درجہ قربت و خدمت کے بیشمار نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں؟ کیا دولتمند اور امراء قسم کے مسلمانوں

کی کوٹھیوں، ان کے محلات اور ان کے بنگلوں پر غریب مسلمان اس درجہ آزادی اور بے تکلفی سے جا سکتے ہیں جس طرح غربا حکیم صاحب کے اس شاہی محل سے ہمسر کمرہ اور کوٹھی میں بے حجابانہ آتے جاتے رہتے ہیں اور صرف آتے ہی نہیں بلکہ اوپر سے خدا جانے کتنے روپیہ نقد کی دوائیں بھی "لوجہ اللہ" لے جاتے ہیں، اور ایک آپ کے دولتمند اور امرا قسم کے مسلمان ہیں جن کی کوٹھیوں، محلات اور بنگلوں پر انگریزی کتے اور شاہانہ ریاکاریوں کو دیکھ کر غریب اور مظلوم مسلمانوں کی تو ہمت ہی نہیں کہ وہ اُن کے دروازوں سے بھی قریب ہو سکیں، اور ایک اللہ بخشے بڑے مولوی صاحب تھے کہ دن بھر محلہ کے لونڈے ان کے دروازہ پر کھیلا کرتے تھے، شور مچاتے تھے اور بعض اوقات تو مولوی صاحب کے مکان میں پتھر تک پھینک دیتے تھے، مگر مولوی صاحب مرحوم و مغفور تھے کہ کبھی ان بچوں پر خفا نہ ہوتے تھے، ہاں کبھی کبھی یونہی جھوٹ موٹ ان لونڈوں کو مسجد تک بھگا آتے تھے، اور بس، مگر اب جو مسلمانوں نے یورپ والوں کا چلن لیا ہے تو اس حد تک اُن کے غلام اور نقال بن گئے ہیں کہ پاجامہ سے لیکر اپنے مکانات تک یورپ والوں کی وضع قطع کے بنواتے ہیں، اسی لئے دیکھ لیجئے کہ ایسے نقال اور اپنی دیسی وضع کو ترک کر نیوالے پہلے کے لوگوں سے زیادہ بیمار ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ جلد جلد مرتے بھی رہتے ہیں، اور ویسے بھی دولتمندوں میں جاہ و دولت کے لالچ سے کافی سے

زیادہ عمر گذر جانے پر شادی کرتے ہیں، لہٰذا طبی قاعدہ سے ایسے لوگوں کی قبل از وقت پر اناللہ پڑھنا بھی بیکار!

غرض میں جو محترم حکیم صاحب کے اجلاس پر پہنچا تو اس اجلاس کی نفاستوں اور قبلہ حکیم صاحب کی دارا شکوہ کے انداز کی نشست سے میں بقلم خود یہ محسوس کرنے لگا گویا قبلہ حکیم صاحب کسی دبدبہ انگیز عدالت کے صدر ہیں اور میں ایک کسان ہوں جو بغیر وکیل کے اچانک ممدوح کے سامنے آگیا ہوں، چنانچہ یہی ہوا کہ نہ میں یہ سمجھا کہ حکیم صاحب قبلہ یہی ہیں اور مجھے تو ملا رموزی سمجھنے اور ملا رموزی جاننے کے لئے سی آئی ڈی میں بھی برسوں ملازمت کیجئے تو بیکار!

بیکار یوں کہ میں نے جو کم نہ زیادہ بیس برس تک دماغی اور علمی و ادبی بھاڑ جھونکا ہے تو میرے چہرے کی طبعی ساخت بدل گئی ہے اور دریافت کیجئے ڈاکٹر انصاری صاحب سے کہ جو لوگ دماغی اور علمی کام کرتے ہیں اُن کے چہرہ سے خون سمٹ کر دماغ کی لالٹین میں چلا جاتا ہے، اور وہاں جل جل کر چہرہ کو خشک اور بھدا کر دیتا ہے، ادھر افکار و آلام اور مشکلات کا مقابلہ جو سینہ تان کر کیا ہے تو دُبلے پن میں بھی سارے ہندوستان میں یا میرا نمبر اوّل ہے یا حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا، اِدھر آجکل کے مضمون نگاروں، ادیبوں، پروفیسروں اور ایڈیٹروں کی جو وردی ہوا کرتی ہے اسے مصنوعی

اور دکھاوے کی چیز سمجھ کر میں نے کبھی استعمال نہ کی، یعنی نہ یورپ کی فیشن ایبل "عینک" پہننا، نہ شیروانی کی اوپر والی جیب میں روشنائی بھرا ہوا انگریزی قلم لگائے پھرنا، نہ نازک سی گھڑی کلائی پر باندھنا، نہ شیروانی کے پورے بٹن لگانا، نہ زیادہ لچکدار چال چلنا، بس سیدھا سادہ مردِ مجاہد اور کائنات کو ہر لمحہ ٹھکرا دینے والا آوارہ گرد آدمی بنا پھرتا ہوں، اور گستاخی معاف، جب سے یہ بیوی نمبر ۴ کا "عشق" لگا ہے، اور ان بیوی صاحب نے جانتے بوجھتے میری جانب سے جو چپ سادھ لی ہے، تو اس وقت سے تو میری رہی سہی انسانیت بھی ندارد ہے، بس صبح و شام "توکلت علی اللہ" بنا پھرتا ہوں لہذا کوئی وجہ نہ تھی کہ محترم حکیم صاحب مجھے فوراً ہی پہچان جاتے، بس پہچانے بھی ہوں گے تو اتنا کہ ہوگا کوئی الفت کا نہیں نہیں کھانسی زکام کا مارا ہوا مریض، اس لئے موصوف کے ایسے تیور دیکھ کر میں نے ہی بے حجابی کر عرض کیا کہ ایڈیٹر صاحب "ہمدرد صحت" کون ہیں؟ اس پر ممدوح نے "میں ہوں" اس درجہ دھیمی آواز سے کہا، گویا مجھ سے نہیں بلکہ اپنے ہی دل سے فرما رہے ہیں کہ "میں ہوں ایڈیٹر "ہمدرد صحت"۔ اب میں نے جو یہ دیکھا ادھر اپنی خاکسار قسم کی حیثیت کو دیکھ کر خیریت اسی میں سمجھی کہ فوراً ہی کہدیا کہ "میں ملا رموزی ہوں" اب کیا تھا محترم حکیم صاحب کی علمی قدردانی اور اسلامی تواضع کا دریا امنڈ آیا، مگر نہایت درجہ سکون اور وقار کیساتھ، یہ ہمارے آپ کی

طرح نہیں کہ:-

اخا ملا رموزی صاحب کہا اور مارے محبّت کے بے طرح لپیٹ گئے، لٹک گئے، چمٹ گئے، اور کہنے لگے خیریت تو ہے؟

اچھّے تو رہے؟

کب تشریف لائے!

اماں بہت دن میں نظر آئے!

کہو وہ ننھّے میاں کی والدہ کہاں ہیں؟

اماں بڑے بے مروّت ہو بھئی، خط کا جواب نہیں دیتے!

اچھا تو بتاؤ کہ کھانا کھا کر آئے ہو یا لاؤں کھانا؟

خیر یہ تو بتاؤ کہ آج کون سے سینما میں چلیے گے؟

دوست ابکی مرتبہ تو تم نے گورنمنٹ کی خوب ہی خیر لی ہے اپنے مضمون میں! حق تو یہ ہے کہ دوست خوب لکھتے ہو!

میں تو یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں تو تمہارا جواب نہیں؟

غرض محترم حکیم صاحب نے بکمال خلوص وکرم اپنا تحریری کام چھوڑ دیا، خیریت دریافت فرمائی، اور اس بات پر اظہار افسوس فرمایا کہ میں چار پانچ دن سے دہلی میں موجود ہوں

مگر قبلہ حکیم صاحب کو اطلاع نہ ہوئی۔

اس کے بعد میں نے یہ تو پوشیدہ رکھا کہ میں بغیر سواری اور ناشتے کے، چار چھ میل گھوم کر آرہا ہوں، اس لئے مارے شدید پیاس کے محرم کی دسویں تاریخ بنا ہوا ہوں بلکہ صرف اتنا عرض کیا کہ "ذرا پانی منگا دیجئے" اب اللہ ہی جانے اس حسن انتظام کی خفیہ ترکیب کو کہ محترم حکیم صاحب نے مطب کے کسی دوسرے حصہ میں ربڑ کے ذریعہ بولنے والی گھنٹی تو ضرور بجائی مگر اس میں یہ کچھ بھی نہ کہا کہ دیکھو بھائی ملازم لوگو ہوشیار، ملا رموزی صاحب تشریف فرما ہیں، ایسے ویسے صاحب نہیں، لہٰذا اُن کے لئے سادہ پانی لانے کے عوض شیشہ کے نہایت صاف ستھرے گلاس میں انتہائی حسین شربت لانا کہ دیکھیں تو جام جم سمجھیں اور نوش فرمائیں، تو بغیر عذر وبدلے پھر سے ایسے حسین نوجوان ہو جائیں کہ ان کے حسن کے سامنے پاؤڈر لگا کر حسین صورت بنانے والیاں بھی شرمائیں، پھر انتظامی مستعدی یہ کہ ایک دو باتوں کے بعد ہی میری سیدھی پسلی سے شربت کا سرخ گلاس لئے ایک بزرگ اس تہذیب سے پیدا ہو گئے جیسے خط کے آخر میں کسی نے حدادب لکھ دیا ہو،

اب یہاں سے علماء و حکماء میں اختلاف ہو گیا ہے یعنی:۔

علماء کرام کی جماعت کا خیال ہے کہ اس روح افزاء شربت کے گلاس کو دیکھ کر

ملا رموزی صرف اس لئے خوش ہوا کہ اسے پیاس کی حالت میں شربت حلال کا ایک گلاس مل گیا، لیکن حکماء کا قول ہے کہ اس گلاس کے رنگ، اس کے مزے، اس کی مٹھاس، اس کی طبی لطافت، اور اس کے پینے پر اس کی اُمنگ، ترنگ، طراوت، اور دماغ کو بیشمار شادابیاں اور جوانیاں دینے والی ترکیب سے ملا رموزی کو اسکی بیوی نمبر ہو یاد آگئی، اس لئے اس نے مست و بیخود ہو کر

ایکبار یا غفور کہا اور چڑھا گیا

پس الحق یہ کہ جوانی اور شباب سے بھرے ہوئے اس گلاس کا مجھ نا قدر دان مسلمان قوم کے ادیب کا وہ حال ہوا جو مجلس قانون ساز کے امیدوار ارکان کا کافی رائیں حاصل ہو جانے کے بعد ہوا کرتا ہے، لہذا اب ملا رموزی کا دماغ تھا علم و فراست اور ادب و لطافت کے موج اور رنگ رنگ سمندر تھے جو اُمنڈے چلے آرہے تھے، ادھر حکیم صاحب قبلہ نے ازراہ عنایت علم نوازی کہیں اپنے عملہ ادارہ میں اطلاع کر دی کہ ملا رموزی تشریف فرما ہیں، تو ہو رہا تھا کہ ممدوح کے علم دوست ارکان ادارہ و طبابت میرے آس پاس منڈلا رہے تھے اور گفتگو میں سینکڑوں موضوعات تھے جو چھڑ جانے اور شروع ہو جانے کو بے قرار تھے، مگر اس ہیجانی اور بحرانی سی ملاقات اور گفتگو کے عین وسط میں حکیم صاحب قبلہ کی اس مستعدی اور مرتب دماغی صلاحیت اور بلندی کا مجھے

معترف ہونا پڑا کہ جی تو چاہ رہا تھا کہ ملاز موزی ہو اور ہم ہوں، مگر ساتھ ہی مطب کا تھا وقت، لہٰذا مریضوں کا جو سلسلہ جاری تھا تو حکیم صاحب بار بار مجھ سے اجازت طلب فرما کر اُن کی نبض، ان کی بیماری کی تفصیل، ان کے نئے پُرانے نسخوں کی لکھائی ان کے پرہیز اور ان کو طبی مشورے یوں عطا فرما رہے تھے گویا یہ تمام چیزیں بھی ہماری ملاقات کے ضروری اجزاء ہیں اور ہم لوگوں ہی سے متعلق ہیں، پس ممدوح کے اس انہماک اور اس پر میرے ساتھ اس درجہ توجہ اور خلوص کو محسوس کر کے میں نے ممدوح کو یوں فرصت دی کہ اپنی وفات سے قریب پہنچا دینے والی نبض دکھائی اور عرض کیا کہ میری چند شکایات بھی سُن لیجئے،

محترم حکیم صاحب نے دونوں ہاتھوں کی نبض دیکھی اور میرے عرض کئے بغیر فرمایا کہ آپ کے جگر میں سخت حرارت ہے،

خدا گواہ ہے کہ ممدوح کی اس خداداد فراست اور طبی کمال پر میری حیرت کا وہی عالم ہوا جو سنہ ۱۹۳۲ء میں حکیم حاذق قبلہ مولوی عبدالوہاب صاحب انصاری عرف حکیم نابینا صاحب اور ممدوح کے خلف ارشد قبلہ حکیم عبدالحیٔ صاحب انصاری بی اے کو یہی نبض دکھا کر ہوا تھا، کہ طب ہندوستانی کے ان یگانۂ روزگار ماہرین نے بھی میرے عرض حال کئے بغیر میری صحت کی پوری کیفیت خود ہی بیان فرما دی تھی یا آج

قبلہ حاجی حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی میں یہ کمال پایا کہ صرف نبض دیکھ کر ممدوح نے میری صحیح کیفیت معلوم فرمالی، بس اس وقت جی چاہ رہا تھا کہ اگر دس دن کے لئے بھی ہندوستان بھر کی کوتوالی مجھے ملجائے تو میں ان انگریزی خوردہ ہندوستانی مرد اور عورتوں کو مزا چکھا دوں جو دہلی کے ان ارسطو دماغ حکماء کو چھوڑ کر ڈاکٹری علاج پر مرتے ہیں، خیر حشر بھی یہ ہوتا ہے کہ نہ کامل صحت ہوتی ہے نہ مرض جاتا بلکہ روزانہ چیرے پھاڑے جاتے ہیں، اور گاڑھی کمائی ڈاکٹروں کی فیس میں خرچ ہوتی ہے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی اولاد انجمن حمایت الاسلام کے چندہ سے تعلیم پاتی ہے،

نبض کے بعد محترم حکیم صاحب نے میرے دل وجگر کا معائنہ فرمایا اور اس میں بھی اپنی طبعی ذہانت اور فنی کمال کا حیران کن ثبوت بہم پہنچایا، جس وقت ممدوح میرے دل وجگر کے خراب ہونے کے اسباب معائنہ فرمارہے تھے میں مسلمانانِ ہند خصوصاً دولتمند مسلمانانِ ہند کی اپنے قومی، علمی اور ملکی کارکنوں سے یکسر بے پروا مزاجی اور اپنی بیوی نمبر ۲ کی یکسر بے التفاتی پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اگر یہ دونوں اپنے علمی و قلمی کارکنوں کو نوازتے رہتے اور نوازتی رہتیں تو آج ملّا رموزی کو پھر سے جوان بنانے کے لئے محترم حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ایسے طبیب حاذق کو کیوں اپنا بیش قیمت

وقت ضایع کرنا پڑتا، اور حکیم نابینا ایسے حکیم کامل کو ملّا رموزی کے لئے اتنا وقت نکالنا پڑتا؟

بارے دل وجگر کی خرابی ثابت ہوئے پر میں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے دل وجگر خراب نہیں ہوئے بلکہ علم کُش اور آوارہ منش مسلمان دولت مندوں کے دل وجگر خراب ہوئے ہیں اور دیکھ لینا کہ "تاریخ وطن" میرے اس طبّی معائنہ کو اپنی الفاظ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کرلے گی جن میں ان حکمار عصر کے یہ احسانات بھی محفوظ ہونگے،

معائنہ کے بعد عام حکیموں کے مطلب کے قاعدے سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ بس اب دس بارہ آنے کا کاغذی نسخہ مل جائیگا جس میں گُل نیلوفر، عناب، گاؤزبان، اور خمیرہ مروارید لکھا ہوگا، میں اسے بازار سے خریدوں گا اور غریب بیوی اسے کوفتہ بخیتہ شب در آب تر کردہ صباح مالیدہ ہمراہ خمیرہ مروارید نوشانند" کرنے میں مصروف رہیگی، مگر ہمدرد دواخانہ کا حُسن انتظام یا حکیم صاحب قبلہ کی علمی فیاضی کہ ابھی میں اسی خیال میں تھا کہ ایک صاحب بادام کا تازہ بتازہ تیل، ہلیلے کا لطیف مربہ اور سفوف کشنیزی کے تین مرتب ومزین ڈبے لیکر آگئے، اور مجھے پیش کردیئے، میں نے کہا قیمت، جواب ملا کہ "نذر"۔

اب آپ لوگ اور لگائیاں قبلہ کی طرف مُنہ کر کے کہیئے کہ قبلہ حکیم حاجی عبدالحمید صاحب

مالک ہمدرد صحت دہلی اور قبلہ حکیم نابینا صاحب دہلوی اور قبلہ حکیم عبدالحئی صاحب، انصاری کے ان نقد اور طبّی احسانات پر میں اپنے کو ان کا ممنون اور زیر بارِ کرم سمجھوں یا ان مسلمان دولت مندوں کا جو میرے مضامین کی لاکھوں بہاروں، رنگینیوں، لطافتوں، ظرافتوں اور حکمتوں کے صرف اتنے قدردان ہیں کہ تیرے میرے سامنے کبھی کبھار اتنا کہدیا کہ "ہاں ملّا رموزی بھی خوب لکھتے ہیں"۔ اور بس، حالانکہ اب تو میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ وہ بیوی نمبر ۱ ہی مجھ پر مہربان ہو جائیں تو باغ و بہار سے اونچی کتابیں لکھ دوں، مگر وہاں دشمنوں نے یہ کہدیا ہے کہ سب کچھ کرنا مگر ملّا رموزی ہی سے قریب نہ ہونا، لہذا اُن کے اس وہم کو ان سے ۲۴ ہزار میل دُور رہ کر کون مٹائے؟

اس لئے امید ہے کہ آپ کی طرف بھی ہر طرح خیریت ہوگی، بزرگوں کو سلام، چھوٹوں کو دعا، بچّوں کو درجہ بدرجہ پیار، اور بیماروں کو ہمدرد دواخانہ دہلی کی دوا، زیادہ حدِ ادب!

(۹)

ایڈیٹر صاحب رسالۂ "کائنات" لکھنؤ کے نام

بعد سلام مسنون آنکہ معلوم ہو کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے اور مزدوروں کے ہاں خیریت نہیں تو "غیر خیریت" کس طرح ہو سکتی ہے، جبکہ اس کے ہاں بجز افلاس کے اور دھرا ہی کیا ہے، اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو آجکل اسکو ڈاکخانوں میں محفوظ کرا دیتے ہیں، اب ہماری آپ کی طرف سے مارے جائیں تو ڈاکخانہ والے اور نہ مارے جائیں تو ڈاکخانہ والے، اور خیر و عافیت آنجناب کی مع خورد و کلاں کے درگاہ خداوند کریم اور گورنمنٹ سے شب و روز نیک مطلوب!

دیگر احوال یہ ہے کہ وہ آپ کے اور میرے بزرگ یا یوں کہیں تو موزوں ہوگا کہ وہ آپ کے ہمارے خدائی فوجدار حضرت محوی لکھنوی مدظلہ آجکل میری غزل اور نظم سے خلصے خوش ہو رہے ہیں اور رباعی میں یوں نہیں کہتا کہ اس کو شاعر کے بڑھاپے کی علامت سمجھتا ہوں، قصیدہ میں یوں نہیں کہتا کہ اب اکبر بادشاہ اور خان خاناں کی طرح اسکا نقد صلہ دینے کے عوض لوگ باگ آغا خاں کی گھوڑدوڑ کا ٹکٹ خرید لیتے ہیں، سو قصہ کوتاہ ممدوح نے میری غزل یا نظم آپکی خدمتمیں بھیجدی،

آپ کی طرف سے مجھے "رسالہ کائنات" نمبر دو بھیج دیا گیا ہے چلئے عوض معاوضہ گلہ ندارد کی فارسی پوری ہو گئی، مگر مجھے لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اب گو الیار میں تو یہ معلوم ہو ہی گیا، اور وہ بھی حضرت خواجہ حسن نظامی ایسے بزرگ کے بالکل منہ کے سامنے کہ آپ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں، اس لئے کہ آپ محسوس فرمائیں کہ ملا رموزی یوں تو مانا ہوا انگحرام قسم کا مضمون نگار ہے، مگر افوہ کہ اپنے چھوٹے بھائیوں کے رسالہ میں بھی بے معاوضہ کچھ نہیں لکھتا، اس لئے اٹھا اور شب کے دو بجکر دس منٹ پر یہ مضمون لکھا کہ سند ہو، کیونکہ آجکل مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ رمضان شریف کا مہینہ ہے، اس ماہ میں دن رات طبیعت موزوں ہی رہا کرتی ہے، ادھر آپکو معلوم ہے کہ میں برسوں کا رات کا آوارہ گرد ہوں، وہ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو کوئی ستر بار تو آپ نے بھی سنا ہی ہو گا کہ ملا رموزی سی آئی ڈی میں ملازم ہے، اس لئے راتوں کو گھر پر نہیں ملتا، مگر آپکی ہماری یکسر ناقدردان قوم نے کبھی یہ دریافت نہ فرمایا کہ آخر ملا رموزی کو یہ رات ہی کے وقت اسکا دولت خانہ ایسا کاٹ کھانے کو کیوں دوڑتا ہے جو وہ رات بھر گھر پر نہیں ملتا؟ حاصل کلام عین تہجد کیوقت یہ خط لکھ رہا ہوں،

اچھا "کائنات" ملا، حال معلوم ہوا، اسکا صفحۂ اوّل دیکھ کر آنکھوں کو نور اور اس کے اندر کے صفحات دیکھ کر دل کو سرور حاصل ہوا، ارے بھئی میں تو یہ دیکھ کر حیران

ہوں کہ یہ خدا نے آپ کو اتنا قدردان لکھنؤ کس طرح دیدیا، کہ اس درجہ حسین رسالہ آپ نے شایع کر دیا، اور قرضدار نہ ہوئے، یہاں تو بھائی اپنی چند حجامت بنی ہوئی سی کتابیں چھپوائی ہیں تو آج تک مہاجن کی قسط سے نجات نہیں ہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ آپ نے بیوی نمبر ۳ کے دو پیٹہ سے زاید حسین سرورق کا رسالہ جاری فرما دیا، اللہ عمر دے اور اقبال، اور لکھائی چھپائی کی رنگینی رعنائی اور دلکشی کا تو جواب ہی نہیں، اس پر بھی اگر اسکو مسلمان لوگ نہ خریدیں تو خدا ان سے سمجھے یا ان کو سمجھے، وہ بات یہ ہے کہ ہم آپ رہتے ہیں انگریزوں کے ہندوستان میں، اور سمجھے یہ بیٹھے ہیں اور وہ بھی ڈاکٹر اقبال صاحب کے دھوکہ دینے پر کہ

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا!

اس لئے ہمارے اوپر انگریز بھائیوں کی تہذیب کا جو اثر پڑ رہا ہے تو ہم آپ سینما کا تماشہ بھی دیکھتے ہیں اور اردو کے رسالوں اور اردو کے اخباروں کو خود گالیاں دے کر انگریزی کے رسالے اور اخبارات اٹک اٹک کر پڑھتے ہیں، خیر بھائی خدا پر بھروسہ کر کے رسالہ جاری رکھئے، وہ جو اب حکومت وفاقی کا دور شروع ہو رہا ہے تو انشا اللہ ہر طرف اردو ہی اردو ہوگی،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ کے ذریعہ میں تمام محترم شعراء سے جھگڑا مول لینا

چاہتا ہوں، تاکہ یہ تمام بھائی میرے خلاف سخت سے سخت مضامین کا سلسلہ شروع کردیں، وہ اس طرح کہ میں نے جو شاعری شروع کی ہے اس کے وجوہ بیان کرتا ہوں بس دیکھ لیجئے گا کہ ایک ادبی جھگڑا کھڑا ہوجائیگا اور اگر اس میں لکھنؤ کے اخباروں نے بھی حصہ لیا پھر تو بغیر پولیس کی امداد کے یہ رفع ہو تو ہو مگر دفع نہ ہوگا۔

یعنی میں نے اُردو کی شاعری میں صرف صنفِ غزل کو لیا ہے اور اس کے حسب ذیل عیوب کو دُور کرنے کے لیے بقلم خود شاعر نہیں بلکہ کلیم غزل گو بنا ہوں، مثلاً میرا خیال ہے کہ علم و بصیرت اور تحقیق و ترقی کے حساب سے عہد حاضر عقلی بلندی کا ایک رنگین زمانہ ہے جبکہ انسان نے ذہنی اور عقلی ترقی میں کمال پایا ہے، مگر اُردو کی غزل حسب ذیل اسقام سے بھری پڑی ہے، مگر غزل گو حضرات نے توجہ نہیں کی، مثلاً:-

ہندوستان کی وہ لاکھوں انسانوں کی جماعت جو غزل سنتی ہے یا پڑھتی ہے خود ہی افلاس و امراض جہالت اور بیروزگاری کے ہاتھوں مضمحل اور پریشان اور مایوس ہے کہ اُوپر سے غزل میں آپ ہجر و فراق اور محبوبہ کے مظالم کی وہ داستان سنائیں کہ مشاعرہ سے گھر تک روتے ہوئے جائے بغیر چارہ نہ ہے تو یہ غزل کیسی؟

غزل میں رقیب کا کردار کیا قوم میں بے حیائی اور بے شرمی کو رواج نہیں دیتا؟

بھری محفل میں محبوبہ بن سنور کر بیٹھی ہے، یار لوگ آوازے کس رہے ہیں اور بے حیا عاشق صاحب ایسی محبوبہ پر فخر فرما رہے ہیں اور غزل کے ذریعہ تمام دُنیا کو اس قسم کی محفل کی تفصیل سنا رہے ہیں اور اچھے اچھے ایم اے پاس لوگ ان تہذیب سوز حالات کو سنکر کہتے ہیں کہ ذرا پھر ارشاد ہو، کیا یہ قوم کی ذہنی موت نہیں ہے؟ عاشق انسان ہے مگر غزل کہتا ہے تو طوطا، مینا، بلبل اور فاختہ بن کر کسی گھونسلہ میں بیٹھ جاتا ہے اور وہاں سے تمام واقعاتِ عشق بیان کرتا ہے، اور بجلی جب گرتی ہے تو اسی کے آشیانہ پر، ایک انسان کو گھونسلہ سے کیا واسطہ، کیا غزل کا یہ کردار قوم میں بے عقلی اور حماقت کو رواج نہیں دیتا؟ عاشق صاحب انسان ہیں مگر جب دیکھیے کوتوالی کے عوض صیاد کے پنجرہ میں بند ہیں، اور پنجرہ میں بیٹھ کر صیاد کے مظالم بیان فرما رہے ہیں اور آب و دانہ کا مطالبہ ہے، کیا غزل کے اس کردار سے جہالت کو رواج نہیں ہوتا؟

عورت کی فطرت اور سیرت سراپا مروّت و وفا اور رحم و کرم ہے، مگر ایک غزل گو عاشق نہیں جس کو اس کی محبوبہ نے سر بازار نہیں تو سر محفل ذلیل نہ کیا ہو، کیا یہ عورت کی سیرت پر خلاف عقل و فطرت حملہ نہیں ہے؟

کیا عاشق کا مقتل آج تک کسی شہر میں نظر آیا، کیا زخمی عشاق کا شفاخانہ کسی نے

اپنی آنکھ سے دیکھا، اگر یہ تمام خرافات تشبیہات اور استعارے ہیں تو سہی مگر علم و عقل کے اس ترقی پذیر زمانہ میں تو انھیں ختم ہو جانا چاہیئے اور ان کے عوض عہد حاضر کے لوازم حسن و عشق کو نظم کرنا چاہیئے جیسا کہ عربوں نے اپنے وقت کا محمل نظم کیا تو ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے وقت کا موٹر کار نظم کریں،

بس یہ اعتراضات ہیں میرے آجکل کی غزل پر، اور اس کے جواب میں میں نے جو غزلیں کہی ہیں، ان کا دیوان مکمل ہو گیا ہے، دعا کیجیئے کہ کوئی علم نواز تعلقہ دار، راجہ مہاراجہ مجھے اپنا جانشین مقرر کرلے تو اس دیوان کو شایع کر دونگا،

اچھا میرے یہ اعتراضات ہیں غزل پر، غزل کے واقعی اقسام ہیں، مگر شام کے وقت امین آباد کے پانچہ کے سرے پر کھڑے ہو کر یہ آواز بلند کہہ دیجیئے گا کہ میرے ان اعتراضات کے جوابات وہ حضرات نہ دیں جن کی عمر چالیس برس سے آگے نکل گئی ہے، کیونکہ ایسی عمر کے ہندوستانی تو غیب سے رونے کے لئے تیار رہتے ہیں، اور غزل کے یہ جھگڑے میں ان کے بس کے جن کے سینے جوانی اور عشق و عاشقی کے جہنم سے دہک رہے ہیں،

دیگر احوال یہ ہے کہ "کائنات" کے دوسرے نمبر میں آپ نے لکھنؤ کے مناہشی مشاعرہ کا تذکرہ فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ اس کی پہلی طرح منسوخ ہو گئی جو یہ تھی کہ

تجھ کو وفا سے کام کیا تو تو نظر چرائے جا!

سو اچھا ہی ہوا کہ یہ طرح بدل دی گئی، کیونکہ طرح کا مصرع ہی غلط تھا، اصل شعر یُوں ہے کہ ؎

میری تباہیوں کا کیا عشوہ طرازیاں تو ہیں
تجھ کو وفا سے کیا غرض تو تو نظر چرا بھی جا

یہ شعر حضرت احمد مجددی بھوپالی کا ہے،

اچھا دُوسری طرح ہے ؎

ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں!

ترجمہ یہ ہوا کہ:-

ہمارے اندر منصور کے ہلکے بڑ بڑ پن کی نقل نہیں ہے،

ترجمہ چونکہ عمدہ ہے اس لئے میں نے بھی اس طرح پر غزل کہی ہے، اور چونکہ گوالیار میں آپ کی آواز کا داؤد علیہ السلام پن دیکھے ہوئے ہوں، اس لئے آپ ہی کو یہ غزل بھی روانہ کرتا ہوں، اگر مشاعرہ میں آپ دیکھیں کہ لوگ میرے ہر شعر پر وجد فرما کر کہہ رہے ہیں کہ ملّا رموزی صاحب کو چبوترہ پر کھڑا کیجئے، نظر نہیں آتے، ذرا اور اُونچا کیجئے، تب تو کہدیجئے گا کہ یہ غزل حضرت ملّا رموزی صاحب کی ہے، اور میرے اشعار پر لوگ یہ

کہہ رہے ہوں کہ اَرے سبحان یہ حضرت شاعر کب سے بن گئے؟

اماں ہمارے سامنے کا لونڈا ہے،

جی ہاں وہ امان اللہ خاں مرحوم کا داماد،

ارے بھئی اس سے تو کہو کہ میاں تم اپنی گلابی اُردو ہی لکھتے رہو، تم غزل کہنا کیا جانو،

پس اگر یہ رنگ دیکھو، تو میری غزل کو فوراً اپنی غزل کہہ دینا اور میرے تخلص کے عوض اپنا تخلص فِٹ کر دینا، میں یہاں سے حلف کرتا ہوں کہ کسی سے نہ کہوں گا، کہ جو غزل لکھنؤ کے مشاعرہ میں شوکت صاحب نے چلّا چلّا کر "براڈ کاسٹ" کی تھی وہ قرآن مجید کی قسم مجھ ملّا رموزی کی تھی،

اب رہا میری غزل میں کم سے کم اشعار کا ہونا، سو اسکا سبب یہ ہے کہ میں حُسن و عشق میں "مردار خوار قسم کے" حالات کو نظم نہیں کرتا، مثلاً میں محبوبہ سے یہ درخواست نہیں کرتا کہ تُو مجھے جَلائے جا، دفن کئے جا، غارت کئے جا، نہ میں اس کا طالب ہوں کہ مجھے عشق میں محبوبہ تو نہ ملے مگر ہاں غم، فراق اور دردِ عشق مل جائے، نہ میں غزل میں منطق و فلسفے کے نکات حاصل کرتا، نہ میں سوز و تپش عشق سے تپِ دق کا مریض ہونا چاہتا، اس لئے میری غزل کے اشعار کمتر ہوتے ہیں۔

دُوسرے یہ کہ اس طرح کی ردیف ہے "نہیں" گویا اس نے خود شگفتہ اشعار کو بند کر دیا، اب تو ہر چیز میں ہی رونا پڑیگا کہ "طور نہیں، حور نہیں، نور نہیں"۔ اور یہ میں کرتا نہیں کہ ایک طرح کے تمام شگفتہ اور غیر شگفتہ قوافی باندھ کر ہی رہوں، ورنہ بتائیے کہ حُسن دمشق میں مزدُور، مقہور، کافور، مذکور، مسطور، اور مستور وغیرہ کس شگفتگی سے نظم کروں، یہ تو بوڑھے شعرا کا دستور رہا ہے کہ وہ جرمنی تک سے جاکر ایک ایک قافیہ تلاش کر کے لاتے تھے اور باندھ کر چھوڑتے تھے، مگر میں تو صرف شگفتہ قافیئے باندھتا ہُوں۔

دیگر احوال یہ ہے کہ الحمد للہ یہاں ہر طرح خیریت ہے، صرف یہ ہوا ہے کہ بیوی نمبر دو سے میرے دشمنوں نے یہ کہدیا ہے کہ ملّا رموزی مکار ہے، غدار ہے جاسوس ہے، سی آئی ڈی میں ملازم ہے، جس کے قریب جاتا ہے اسی کے خلاف مضمون لکھ دیتا ہے، اس لئے اس سے دُور ہی رہنا، ادھر اس غریب کی عقل اور تجربہ ابھی کم ہے، وہ خود نہیں سمجھ سکتی کہ یہ ملّا رموزی کا دشمن ہے خود ملّا رموزی سے ملکر ان غلط باتوں کی اصلاح کرلُوں، اس لئے میں بھی ہوٹل میں کھانا کھالیتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ ایک دن انشا اللہ میرے دشمن ہی ذلیل ہوں گے، بشرطیکہ وہ اللہ کی بندی مجھ سے مقابلہ تو کرائے، اور ویسے تو جناب لوگ

گاندھی جی نمک کے لئے کہتے ہی رہتے ہیں کہ وہ گورنمنٹ سے ملے ہوئے ہیں!

تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام و دعا،

(۱۰)

ایڈیٹر صاحب "صدائے نسواں" دہلی کے نام

مدیر محترم مجلہ "صدائے نسواں" دہلی!

بعد سلام مسنون آنکہ معلوم ہو کہ یہاں کچھ کچھ خیریت ہے اور غریبوں کے ہاں کچھ کچھ نہیں تو ہر طرح خیریت کس طرح ہو سکتی ہے، اصل خیریت تو ہوتی ہے دولت کی اور وہ بھی بغیر سُود اور قرض کی دولت ہے اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ خداوندکریم سے اور کوتوالیوں اور مجسٹریٹیوں سے شب و روز نیک مطلوب!

دیگر احوال یہ ہے کہ "صدائے نسواں" کا عید نمبر آیا، دل کو سرور اور آنکھوں کو نُور حاصل ہوا، واقعہ یہ ہے کہ "صدائے نسواں" آپ کی ریاست میں آکر صحیح معنی کا رسالہ بن گیا، مضامین نگار آپ نے اتنے جمع کر لئے کہ جب چاہیں آپ کسی حکومت پر دھاوا بولدیں، بات یہ ہے کہ آپ بقلم خود ذی علم ہیں، وسیع تجربہ کار ہے، اور مردم شناس ہیں، اور اُوپر سے قدر دان، اس لئے آپکو بہتر سے بہتر مضمون نگار

اور خیر خواہ انسان مل گیا، اور ایک میری بیوی نمبر ۲ ہیں جو ایک ہی وہم میں مبتلا ہو کر مجھ سے دور ہو چکی ہیں، اور وہ وہم یہ ہے کہ دنیا میں اگر امریکہ اور افریقہ والے بھی کچھ لکھتے ہیں تو وہ سمجھتی ہیں کہ یہ بھی ملا رموزی ہی نے لکھا ہے، اور اگر فرانس میں سے کوئی شخص اعتراض کرتا ہے تو وہ سمجھتی ہیں کہ یہ اعتراض بھی ملا رموزی ہی نے کیا ہے، اور یہ صرف اس لئے کہ موصوفہ آپ کی طرح وسیع تجربہ اور وسیع نظر کی مالک نہیں ہیں، اس لئے میں نے بھی اُن کے دماغ کو خدا کے حوالہ کر کے اُن کے خیال کو ترک کر دیا ہے، ورنہ آپ ہی بتائیے کہ اگر میرے مخالفین کے کہنے پر آپ بھی بھروسہ کر لیں تو آج آپ کے اور میرے درمیان یہ عشق کس طرح باقی رہتا؟

دیگر احوال یہ ہے! یہ زنانہ رسالے اُردو میں اب اتنے ہو گئے ہیں کہ اگر انھیں جمع کر لیں تو ہم آپ اگر بڑی حکومت پر نہیں تو کسی چھوٹی موٹی ریاست یا کسی تعلقہ پر کامیاب حملہ کر سکتے ہیں، مگر ایک کمی ہے، وہ یہ کہ ان رسالوں میں ظریف مضمون نگار عورتیں نہیں ہیں، اور میں ان تمام مردوں کو بے حد جاہل اور چھچھورا سمجھتا ہوں جو اپنی بیوی یا لڑکی کے نام سے خود مضمون لکھتے ہیں، اس حرکت سے غریب عورتوں کی انشاء پردازی کا اعتبار کم ہوتا ہے، یہ قاعدہ تو بعض محکمات کا ہے، جن میں بعض نالائق افسر ہوتے ہیں، تو اُن کے ہاں اُن کے بے بس

ماتحت لوگ ان کی طرف سے مراسلہ، حکم، فیصلہ، اور دُوسرے تحریری کام کر کے خود رکھ دیتے ہیں اور افسر صاحب اُن کے لکھے پر اس گھمنڈ کے ساتھ لال روشنائی سے دستخط کرتے ہیں، گویا یہ تمام تحریری کام خود افسر صاحب ہی نے کیا ہے، مگر افسر صاحب کو خبر نہیں کہ ان کے نام سے احکام، مراسلے اور فیصلے لکھنے والے ماتحت دفتر سے باہر نکلتے ہی دُنیا کے تمام ملّا رموزیوں سے کہدیتے ہیں کہ ان کے نام سے ہم لکھتے ہیں، اور وہ صرف دستخط کرتا ہے،

سو جو شوہر یا باوا ایسا ہو کہ وہ اپنی عورتوں کے نام سے خود لکھتا ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی عورتوں کے اعتبار کو کم کرتا ہے، ہائے اگر عورتوں میں ظریف ولطیف مضمون نگاری کا شوق ہو جائے تو چند دن بعد کسی ایک زنانہ رسالہ کو ملّا رموزی صاحب کی ضرورت باقی نہ رہے، اور عورتوں کو ظریف ولطیف تحریروں کی ضرورت زائد ہے کہ عورتیں ہی زائد پریشان، مشکلات اور مصائب میں مبتلا رہتی ہیں، شوہر والیوں کو اپنے بے وفا اور بے پروا شوہروں کا طاعون تباہ کر رہا ہے، اور نوجوان لڑکیوں کے حق میں بوڑھی والدہ صاحبہ اچھا خاصہ مراق اور مالیخولیا بنی رہتی ہیں، جہاں لڑکی نے چھم کی آواز پیدا کی کہ والدہ صاحبہ نے اس کے پاؤں پر نصیحت کی کلہاڑی رسید کی، کہ کیوں تو نے زور سے قدم رکھا، جس سے

تیری چوڑیاں ہوئیں، اور اگر کسی گھر میں نانی صاحبہ اور دادی صاحبہ بھی زندہ ہیں تب تو سمجھ لیجئے کہ اب اس گھر کی نوجوان لڑکی کا فاتحہ تک ہو چکا، اگرچہ بوڑھی عورتیں نوجوان لڑکیوں کے حق میں کیمیا کا نسخہ ہیں، مگر ان کی بکواس اور بیجا اعتراضات سے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ اس لڑکی پن سے تو لڑکا ہو جانا منظور،

اس لئے ضرورت ہے کہ عورتیں ظریف اور ہنسانے والے مضامین بھی لکھیں، مگر یہ نکتہ سب کو بتا دیجئے کہ وہی عورت ظریف اور ہنسانے والے مضامین لکھ سکتی ہے جو فطرتاً اور قدرتاً ہنسانے والی ہو، اور جن کے اندر قدرتاً ظرافت کی قوت نہیں وہ لاکھ کوشش کریں ان میں یہ سلیقہ پیدا نہیں ہو سکتا، امید کہ اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھ کر ظریف عورتیں ظریف مضامین لکھنے شروع کر دینگی،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ میں تصاویر نہیں، تو میں یوں رائے نہیں دیتا کہ آپ کے محلہ ہی میں حضرت مخترم قبلہ مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علماء ہند بھی رہتے ہیں، اگر ممدوح کو معلوم ہو جائے کہ ملا رموزی نے تصویر چھاپنے کے حق میں رائے دی ہے تو وہ آئندہ جمعیۃ العلماء کے دفتر میں میرا قیام و طعام حرام کر دینگے، جس میں از قیام جمعیۃ تا ایندم یہ نیاز مند مقیم ہوتا ہے،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے "سدائے نسواں" میں ادبی چیزیں پیش کر کے

عورتوں کی ذہنی زندگی کو گویا شفا بخش دی، یعنی اگر صرف اصلاحی اور اخلاقی مضامین ہوتے اور عاقبت کا خوف ہی بڑھایا جاتا تو عورتیں کل مرنیوالی ہوتیں تو آج ہی مر کر رہ جاتیں، مگر غنیمت ہے کہ آپ نے "تمنائے محبت" اور "نشاط روح" کے عنوان سے بھی چند غزلیں شایع کر کے عورتوں کو بھی چند لمحات ذہنی اور فکری جوانی کے عطا کر دیئے، آپ کی اس ترکیب سے خاکسار کو یہ فائدہ پہنچا کہ وہ بھی "ندائے نسواں" کے لئے اپنی ایک غزل پیش کرتا ہے،

اب میری غزل بازی کے دُوسرے اہم اسباب میں سے ایک سبب آپ بھی سُن لیجئے، وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ہندوستانی باشندے انگریز یا ایرانیوں کی رعایا ہیں اور رعایا ہمیشہ بادشاہ قوم کی نقل کرتی ہے، لہذا جب ہندوستانیوں کے بادشاہ ایرانی تھے، اسی زمانہ میں اُردو میں غزل بازی شروع ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ جیسی غزل ایرانی لوگ کہتے تھے ویسی ہی غزل ہندوستانی کہنے لگے، اور غلامانہ دماغ ہونے کیوجہ سے ہندوستانیوں کو آج تک توفیق نہ ہوئی کہ وہ خود سوچتے کہ ہم جو غزل کہہ رہے ہیں وہ عقل اور فطرت کے موافق ہے یا نہیں؟ لہذا اس نہ سوچنے سے اُردو کی غزل میں ہزاروں حماقتیں روزانہ بھر دی جاتی ہیں، اور اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹران کو آنکھ بند کر کے روزانہ چھاپ دیتے ہیں، جن کو پڑھنے والے

دماغی حیثیت سے مہملات پسند بن رہے ہیں، مثلاً اردو کی غزل میں محبوب کو "رقیب نواز" کہا جاتا ہے، اب فطرت اور عقل کی رو سے اگر مرد کا محبوب عورت ہو سکتی ہے تو بتایئے عورت فطرتاً ایک کے سوا، دوسرے سے کب محبت کرتی ہے، لہٰذا اسکو رقیب نواز کہنے سے عورت کی سیرت کی توہین ہوتی یا نہیں؟ پھر اردو کی غزل میں محبوب کو ظالم، مکار، عیار، ستم شعار، بے وفا، اور بے مروت کہا جاتا ہے، اب عقل اور فطرت کی رو سے بتایئے کہ عورت جس سے محبت کرتی ہے یا جو شخص عورت سے محبت کرتا ہے اس پر عورت کب ظلم کرتی ہے، اس کے خلاف واقعات تو بتاتے ہیں کہ اگر عورت محبت کرتی ہے تو پھر وہ محبت والے پر اپنا جان و مال تک قربان کر دیتی ہے، بس حد ہے کہ شوہر اگر بے وفا ہے اور دوسرا شخص اس سے سچی محبت کرتا ہے، تو وہ بے وفا شوہر تک کو کلہاڑی سے ختم کر کے محبت کرنے والے کا ساتھ دیتی ہے، مگر اردو کے بیہوش شاعر تو اپنی غزل میں روزانہ عورت کو بے وفا، مکار، غدار، عیار اور بے مروت لکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ یا تو مردوں سے محبت کرتے ہیں یا رنڈیوں سے، کیونکہ بے مروت اور بے وفا تو مرد ہوتے ہیں، جیسے کہ آپ یا میں، یا پھر رنڈی ہوتی ہے، جو پیسہ کمانے کیوجہ سے ہر شخص کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتی ہے، اور اصل میں کسی ایک کی وفادار نہیں ہوتی۔

لیکن ایک شریف عورت اگر کسی سے محبت کرے یا اس سے کوئی محبت کرے تو وہ دونوں حالتوں میں عورت سے زائد باوفا، بامروت اور صاحب کرم و نوازش مرد نہیں ہو سکتا، لہٰذا اس فطری دلیل کی رُو سے اُردو کی ایسی تمام غزلیں عورتوں کی توہین ہیں، جن میں محبوب کے نام سے اصل میں عورت کو رقیب نواز یا ظالم اور بے وفا کہا جاتا ہے، مگر لاحول ولا قوۃ آپ کہیں گے کہ میں خط میں عورت کی وفاداری کی کیوں تعریف کرتا ہوں، اس لئے معلوم ہو کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے اور ہاں بھئی، وہ خوب یاد آئی، کہ اگر دہلی میں خالص گھی کا نرخ ارزاں ہو تو مجھے ضرور اطلاع دینا، کیونکہ مجھے جن چیزوں کا شوق ہے اُن میں خالص گھی اور رولز رائس موٹر کار کی سواری اور وہ بھی چاندنی رات میں، اس لئے اگر آپ کے ہاں رولز رائس موٹر کار کا نرخ ارزاں ہو گیا ہو تو براہ کرم خود خرید کر میرے نام اس پتہ سے بھیج دیجئے گا اور ہاں ایک اور چیز کو بے حد پسند کرتا ہوں! فقط۔

۱۱

ایڈیٹر صاحب "دیہاتی" کے نام

رسالہ "دیہاتی" شہر ملتان کے ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

آپ کا ۲۵۔ ماہ فروری ۱۹۳۰ء کا لکھا ہوا کارڈ جس میں کہ آپ نے بجائے اُردو کے انگریزوں کی زبان میں اپنا نام اور پتہ اور عہدہ اور تاریخ لکھی تھی، ملا جس کا یہ مطلب ہوا کہ اگر ہم زبان انگریزی سے واقف نہ ہوتے تو آپ کے کارڈ کا مضمون تو ہم خود پڑھ لیتے اور آپ کا نام، پتہ، تاریخ اور عہدہ دُوسروں سے پڑھواتے پھرتے، دیکھ کر خوشی ہوئی اور بہت خوشی ہوئی،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ کے رسالہ "دیہاتی" کو ہم جب پڑھتے ہیں، تو بھئی مسلمان ہو تو یقین کرنا کہ ہمیں کسانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے بہت یاد آتے ہیں وجہ یہ ہے نا کہ خدا نے ہمیں بھی دُو چار بچوں کا باپ بنایا ہے، مگر وہ ہمارے بچے تو نکلے حد سے زیادہ نالائق، اس لئے کہ ہمارے بچوں کی ماں نے تو پڑھا ہے اسکول میں اور اسی وجہ سے ان کے مزاج میں ہر قسم کا نخرہ موجود ہے؛ خود بھی کمخواب کا پاجامہ، ریشم کی قمیص اور ریشم کے موزوں کے ساتھ انگریزوں کا بنایا ہوا کالے رنگ کا پمپ جوتا پہنتی ہیں، اور سر پر تو وہ دوپٹہ بس ہمارے سامنے تو اوڑھے پھرتی ہیں ورنہ ویسے وہ دن بھر گھر میں بے دوپٹہ پھرتی رہتی ہونگی، کیونکہ آجکل تو عورتوں نے بھی اسکول کے لڑکوں کی طرح سر کے بال کٹا دیئے ہیں، اچھا ہے کٹا دینے دیجئے! اپنی طرف سے خدا کرے یہ ننگی پھرنے لگیں

تو ہمیں اس سے کیا مطلب، تو بس جناب اس لئے جب کسی بچّہ کی ماں خود ہی بڑی فیشن والی اور بڑی نخرے والی ہو گی تو وہ اپنے بچّوں کو بھی اپنے ایسا ہی بنائے رکھیگی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہماری طرف کے اکثر بچّے چُست پاجامہ، ریشم کی نازک سی قمیص، بھڑک والی قیمتی کپڑے کی شیروانی پہنے، آنکھوں پر بے ضرورت چشمہ لگائے، کلائی پر عمدہ سی گھڑی باندھے اور ہاتھ میں نازک سی چھڑی لیکر جب بازار جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوہ قاف کی کوئی پری سودا خرید نے جا رہی ہے، لَاحَولَ وَلَاقُوۃ۔

مگر شجاعت، بہادری اور ہمّت کا یہ حال ہے کہ اگر ان لونڈوں کے ہم آپ ذرا کھینچکر ایک درجہ اوّل کا چانٹا رسید فرمادیں، تو تین میل دُور جا پڑیں اور جب تک ڈاکٹر علاج نہ کریں تو ہوش ہی نہ آئے، تو ایسے لڑکے ہونے سے تو لڑکی ہو جانا اچھا ہے!

دُوسری قسم کے بچّے وہ بھی ہوتے ہیں، جو کالجوں میں پڑھتے ہیں، اپنے چہرہ پر ایک بال باقی نہیں رہنے دیتے، داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی صاف کرتے ہیں، قیمتی چشمہ لگاتے ہیں، اور دن رات انگریزوں کا کوٹ پتلون پہنے پھرتے ہیں، بائیسکل کے بغیر چل پھر نہیں سکتے، ہاتھ میں ہر وقت اخبار "پائنیر"

رہتا ہے، اپنی مادری زبان کی جگہ انگریزوں کی زبان میں باتیں کرتے ہیں، مگر حوصلے، محنت، کوشش اور تکلیف کے نام سے ان کا کوٹ پتلون تک لرز جاتا ہے، بس ہوٹلوں میں بیٹھے شاعروں کے ساتھ نارنگی کا شربت پیا کرتے ہیں، ان سے اگر جھوٹ کو کہدیجئے کہ وہ لڑائی ہوگئی، یا وہ پولیس آگئی تو سائیکل پر بیٹھ کر ایسے بھاگتے ہیں کہ اپنے گھر کے بڑے کمرہ میں بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے، خیر صاحب وہ عجیب کا حال تو خدا جانے، مگر سنا یہ ہے کہ اس قسم کے لونڈے آپ کے پنجاب میں بہت زیادہ ہیں، ممکن ہے کہ کسی دشمن نے ہم سے ایسا کہدیا ہو، تو بس اس لئے ہمیں یہ کسانوں کے بچے بہت زیادہ پسند ہیں، اور پسند اس لئے ہیں کہ ان غریبوں کو جتنے بھی میلے گندے اور پھٹے ہوئے کپڑے آپ چاہیں پہنا دیں، یہ خوشی خوشی پہن کر کھیت پر چلے جاتے ہیں، یہ بچے انگریزوں کے بنائے ہوئے جرمنی کے کھلونے" خرید کر اپنے ماں باپ کی دولت برباد نہیں کرتے، بلکہ کھیتوں پر بیٹھ کر ٹھیکروں اور گھاس یا لکڑیوں سے کھیلتے رہتے ہیں، کھیتوں کے کانٹوں سے یہ نہیں گھبراتے، دھوپ سے یہ بیمار نہیں ہوتے، کنوئیں میں گرجانے سے یہ نہیں ڈرتے، صبح ہی صبح چائے پینے اور بسکٹ کھانے کے لئے یہ نہیں روتے، روزانہ بازار سے مٹھائی، میوہ،

اور پھول پھول کے کپڑے خرید کر لانے کے لئے یہ شور نہیں کرتے، کوٹ، پتلون، انگریزی ٹوپی، موزے، مفلر، ٹائی اور بائیسکل کو تو یہ بیچارے جانتے بھی نہیں، کہ یہ چیزیں مرد ہوتے ہیں یا عورتیں؟ اور شیر، تیندوے، اور دوسرے خون پی جانے والے جنگلی جانوروں تو یہ بچے بکری بکرا، مرغی مرغا، گھوڑی گھوڑا اور گدھی گدھا سمجھتے ہیں،

اور بھی غضب خدا کا یہ بچے گیارہ گیارہ بجے رات کو جنگل میں بہنے والی ندی پر چلے جاتے ہیں اور وہاں چاندنی رات کے کھیل کھیلتے رہتے ہیں، مگر چاہو کہ یہ ڈر جائیں چمک جائیں، لرز جائیں، کانپ جائیں، سہم جائیں یا جھجک جائیں تو استغفراللہ پڑھیے، اُن کے پاس تو ڈر، خوف، بزدلی اور کم ہمتی کا کوئی ذکر ہی نہیں،

اور ایک ہم آپ ہیں کہ ۹ بجے رات ہی کو پولیس کے گشت کرنے والے سپاہی کی آواز سے ڈر کر پلنگ سے نیچے گر جاتے ہیں، اور یاد ہوگا کہ شہروں میں اگر کبھی زیادہ رات کو تھیٹر، یا سینما کا تماشہ دیکھ کر ہم، یا آپ تنہا گھر آتے ہیں تو کیسا دل دھڑکتا رہتا ہے، اور یہ اسکول کے جوان جوان لونڈے تو بغیر اپنی جماعت کے لڑکوں یا شاعروں کے تھیٹروں سے گھر واپس ہی نہیں آتے، تو اس حساب سے یہ کسانوں کے بچوں کے دل و دماغ میں ہمت، حوصلہ، بہادری، دلیری، محنت پسندی، صبر اور ہر حال میں خوش رہنے کی قوتیں بہت کافی ہوتی ہیں، کتابوں میں پڑھا ہے کہ

جن لوگوں کے بچّوں میں بچپن ہی سے ہمت، دلیری، بہادری، صبر اور محنت کو پسند کرنے کی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں وہی دُنیا میں بادشاہ، وزیر، کوتوال اور تھانیدار ہوتے ہیں، جیسے آپ نے سُنا ہوگا کہ ملک ترکستان کے بادشاہ آجکل مصطفےٰ کمال پاشا ہیں، یہ بھی ایک غریب کسان ہی کے بیٹے ہیں،

بس اپنی ہمّت اور بہادری سے سنہ ۱۹۲۱ء میں یونان کی فوجوں سے خوب جو لڑائی لڑے، تو بس جناب ترکستان کے بادشاہ بنا دیئے گئے، اور یہ بھی آپکو معلوم ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ملک ایران کے بادشاہ جو رضا خاں پہلوی بنائے گئے یہ بھی ایک معمولی سپاہی کے لڑکے تھے، مگر بچپن ہی سے ان کے اندر ہمّت، حوصلہ، بہادری، اور محنت کرنے کی عادت تھی، انہوں نے بھی بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں، اور ملک ایران کے بادشاہ ہو گئے،

غرض قصّہ کون کہے! یہ کسانوں کے بچّے بڑی بھولی اور پیاری صورت کے ہوتے ہیں، ان کے اندر مکّاری، دھوکا، فریب، بے ایمانی، دغابازی، چوری، قمار بازی، غرور، اکڑ، بناوٹ اور خود غرضی کی عادتیں نہیں ہوتیں، مگر ہاں یہ بچّے بہت کم عمر ہی سے چلم اور حقّہ پینا سیکھ جاتے ہیں، تو اس عادت سے آپ ایک دن جا کر ان سب کو منع کر دینا، کیونکہ کسانوں کے بچّے شہروں کے رہنے والوں سے بہت زیادہ

ڈرتے ہیں، ہر شہر کے آدمیوں کو بادشاہ سلامت یا کوتوال سمجھتے ہیں، اور صورت دیکھتے ہی گھروں میں جا کر چھپ جاتے ہیں، گویا ان کے خیال میں شہروں میں رہنے والے انسان ایک طرح کے بھوت ہوتے ہیں، یا ظالم، ہمارے خیال میں کسانوں کے بچے ہمیں اور آپکو بھوت تو کیا سمجھتے ہوں گے مگر ہاں ظالم ضرور سمجھتے ہیں، اور یہ اس وجہ سے کہ آج تک شہروں کے رہنے والے کسانوں کو ایک طرح کا غلام بلکہ جانور سمجھا کرتے تھے، مگر اب کچھ دن سے یورپ کے رہنے والوں نے اپنے ہاں کے مزدوروں اور کسانوں کی جو قدر اور عزت کو بڑھانا شروع کیا، تو ہندوستانیوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ بھی بیچارے کسانوں کو تعلیم تربیت، تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کے ذریعہ ترقی دینا چاہتے ہیں، اور چونکہ اس سے پہلے ہم آپ بھی کسانوں کو "گنوار" بلکہ گنوار کا لٹھ سمجھتے تھے، اس لئے یہ تھانیدار اور تحصیلدار لوگ جب دیہات میں جاتے تھے تو ان بیچارے کسانوں سے پہلے تو تُو تڑاق سے پیش آتے تھے، پھر انھیں گالیاں دیتے تھے، پھر مارتے تھے، اور پھر درخت سے باندھ کر ان سے بغیر روپیہ دیئے گاڑی، بیل، آٹا، گھی، لکڑی، فرش، لحاف، چارپائی اور لالٹین تک لے لیتے تھے اور یہ بیچارے جاہل اور بے پڑھے کسان مارے ڈر کے منہ سے اُف بھی نہیں کہتے تھے، اور اگر کبھی اُف یا اُفو کہدیتے تھے تو یہ تھانیدار لوگ انھیں اور زیادہ مارتے تھے

ہوتے ہوتے پھر ہم آپ بھی جب گاؤں جاتے تو ان جاہل اور بے خبر کسانوں سے تھانیداروں ہی کی طرح پیش آتے،

بس اس کا اثر یہ ہُوا کہ کسان اور اُن کے بھولے بچے ہملوگ آپ کے نام سے لرزنے لگے، اور یہ اسی زمانہ کا ڈر اُن کے دلوں میں اب تک بھرا ہوا ہے، اس لئے آپ آج تمام دیہات کے بچّوں کو پیار کر کے اور گود میں لے کر سمجھا دیجئے کہ وہ آئندہ کسی سے نہ ڈریں، جو شخص ان سے "تُو" کہکر بولے تو ان بچّوں کے ہاتھ میں جو چیز بھی ہو یہ اُس "تُو" کہنے والے کے مُنہ پر مار دیں، اور اس کی کوئی پروا نہ کریں، اگر مقدمہ چلیگا تو ہم اور آپ مقدمہ چلانے والے سے سمجھ لیں گے، کیونکہ صاحب یہ تو بڑی ہی زیادتی ہے، اور ظلم ہے کہ شہر کے رہنے والوں کے بچّوں کو تو ننھے میاں، چھن میاں، پیارے میاں، دُلارے میاں اور بانکے میاں کہا جائے، اور انھیں کوئی تھانیدار آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور یہ بیچارے کسانوں کے بچّوں کو جاہے چانٹا رسید کردے اور جو چاہے گالی دیدے، حالانکہ کسانوں کے بچّے بھی آخر کو انسانوں ہی کے بچّے ہیں، کچھ گیہوں اور چاول کے بچّے تو ہیں نہیں، تو دیکھئے کہ خط کس قدر لمبا ہو گیا، حالانکہ ہمیں آپ سے اور بھی ضروری باتیں کہنا تھیں خیر تو اتنا اور سُن لیجئے کہ یہ کسانوں کے بچّوں کے دلوں سے شہر والوں کا خوف دُور کر دیجئے، مگر اُنھیں

اتنا بھی آزاد نہ کر دیجئے گا کہ یہ اپنے پڑھانے والے استاد پر بھی کسی دن لٹھ لیکر دوڑ پڑیں کیونکہ صاحب اُستاد کا رتبہ تو باوا سے بھی بڑا ہوتا ہے، اور جو بچہ کہ اپنے اُستاد کو ناخوش کریگا وہ اور اُسکا اصل باوا دوزخ میں جھونک دیا جائیگا، اور اس کی تمام کھیتی جلکر خاک ہو جائیگی، تو ہاں وہ خوب آئی، اصل میں کہنا یہ تھا کہ کسانوں کے بچّوں سے پہلے آپ کسانوں ہی کو سمجھا دیجئے کہ دیکھو میاں کسانو! اگر اپنی اور اپنی اولاد کی خیریت چاہتے ہو تو سب سے پہلے یہ کام کرو کہ اپنے دلوں کو بہادر بناؤ، پھر ذرا صاف اور عمدہ قسم کا لباس پہننا اختیار کرو، کیونکہ اچھے لباس کے اختیار کرنے سے دوسروں کے دلوں پر بھی اثر پڑتا ہے اور خود بھی دماغ میں ترقی کا خیال پیدا ہوتا ہے، مگر یہ نہیں کہ تمام کسان بھائی کل ہی سے نازک نازک ہی شیروانیاں اور لکھنوی ٹوپیاں استعمال فرمانے لگیں، یا پھر فرنگیوں کے کوٹ پتلون پہننا شروع کردیں، مگر ہاں یہ بھی نہیں کہ بالکل ہی ننگ دھڑنگ پھرتے رہیں، پھر یہ کریں کہ اپنے بچّوں کو لکھا پڑھا کر طاق کردیں، کیونکہ اب آگیا ہے زمانہ ایسا کہ کسانوں ہی کے بچے ہندوستان کے بڑے بڑے افسر ہوا کرینگے اور کھیتی باڑی کا کام کرینگی عورتیں یا بوڑھے!

اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ کسانوں کے بچّوں کو روزانہ تازہ تازہ

اخبارات پڑھ کر سُنائے جائیں، اور ہم تو ان کسانوں کو "دیندار" ہی نہیں سمجھتے جو روزانہ اخبارات نہ پڑھتے ہیں نہ سنتے، مگر ایڈیٹر صاحب! ایمان کی بات تو یہ ہے کہ اس میں آپ کا بھی تھوڑا بہت قصور ہے، کیونکہ یہ تو آپ کو چاہئے کہ آپ جا کر ہر گاؤں میں اخبارات کا بندوبست کر دیں، کیونکہ یہ اخبار والے تو اخبار نکالتے ہیں اپنے اور اپنے بچّوں کے لئے روپیہ کمانے کیواسطے، اور لکھتے یہ ہیں کہ ہم تو جناب قوم کے خادم ہیں، خیر خواہ ہیں، مگر جناب ان کی مکّاری اور خود غرضی کو کوئی ہم سے آکر دریافت کرے تو ہم اسے بتائیں کہ اخبار والے کس قدر خود غرض ہُوا کرتے ہیں،

بس ان کی دوستی سے تو پولیس والوں کی دوستی اچھی، کیونکہ یہ بیچارے بعض وقت رات کو بغیر روشنی کے بھی ہر جگہ جانے کی اجازت تو دیدیتے ہیں، لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان اخبار والوں سے اپنا کوئی کام لے لیں تو یہ لوگ اوّل تو آپکے ایسے خطوط کے جوابات ہی نہ دینگے، اور جو جوابات بھی دینگے تو اپنے مطلب کے مگر لَاحَولَ وَلَاقُوۃ -

دیکھئے! ہم کیا لکھ گئے، خیر تو آپ ان کسان بھائیوں سے صاف صاف کہدیجئے کہ اپنے بچّوں کو اب کھیتوں اور جنگلوں میں جانور بنا کر نہ پھرائیں، بلکہ

انھیں دُنیا میں سب سے بڑا آدمی بنانے کی فکر کریں، اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ فوراً انھیں لکھنا پڑھنا سکھائیں، اور جب یہ کسان لوگ اپنے پاس کے شہر میں کسی کام کے لئے جایا کریں تو اپنے بچّوں کو ضرور ساتھ لے جایا کریں، تاکہ وہ شہر کے بچّوں کا لباس، اُن کی بات چیت، ان کا سینہ تان کر چلنا دیکھ لیا کریں، تو اُن کے اندر بھی انسانیت پیدا ہو گی، اور ان کسانوں سے کہتا کہ خدا کے لئے آپ لوگ اپنے بچّوں کی حجامت تو جلد جلد بنوا دیا کیجئے!

اماں! بعض کسانوں کے بچّے تو اس درجہ گندے اور میلے ہوتے ہیں اور اُن کے پاس سے ایسی بدبُو آتی ہے جیسے لاہور کی نالیوں سے آتی رہتی ہے، اور ان بچّوں کے ناخن تو اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ مصافحہ کرنے سے ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے، اور سر کے بالوں کو دھونا اور ان کے اندر خوشبو کا تیل ڈالنا تو یہ لوگ جانتے ہی نہیں، حالانکہ سر کے بالوں کو صاف رکھنے سے عقل بڑھتی ہے۔

مگر صاحب ان کسانوں پر ہمیں اس وقت بہت تاؤ آتا ہے جب یہ اپنے چھوٹے چھوٹے اور نوجوان بچّوں کو اپنے ہی پاس بٹھا کر چلم اور حقّہ پلاتے ہیں، حالانکہ یہ بہت بڑی بیہودگی اور گناہ کی بات ہے، اور ہم نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ اب اس طرف کے کسانوں کے بچّے شراب بھی پیتے ہیں، بس تو پھر جانے دیجئے،

ہم بھی اُن سے بات کرنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ جناب! تمام ڈاکٹر کہتے ہیں کہ جو شخص شراب پیتا ہے اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں دیوانہ ہو کر آگرہ کے پاگل خانہ میں بند کر دیا جاتا ہے،

ہاں اگر یہ بچے شراب کی جگہ دُودھ پیا کریں، تو ان میں کا ہر بچہ کیسا خوبصورت موٹا تازہ اور ہٹا کٹا ہو جائے، اور اس سے تمام گاؤں کے لوگ مارے خوف کے بات تک نہ کر سکیں،

غرض قصّہ کون کہے، کسانوں کی بھولی صورت والے بچے کیسے عمدہ ہوتے ہیں، پھر یہ بچے اگر تعلیم حاصل کر لیں تو پھر ان سے زیادہ بہادر، ان سے زیادہ ایماندار، ان سے زیادہ خوبصورت کون ہو؟

تو امید ہے کہ آپ ہماری طرف سے ان کسانوں سے کہدیں گے کہ تم اپنے بچوں کی تعلیم کو بڑی دولت سمجھو اور جس قدر جلد ہو انھیں لکھا پڑھا کر طاق اور الماری بنا دو!

افسوس کہ آپ کو اصل بات تو لکھی ہی نہیں، خیر انشاء اللہ زندہ ہیں تو دُوسرے خط میں لکھ دیں گے!

(۱۲)

ایڈیٹر صاحب "صدائے نسواں" دہلی کے نام

رسالہ "صدائے نسواں" دہلی کے مہتمم طباعت واشاعت کو بعد حمد و نعت اور سلام مسنون کے معلوم ہو کہ آج سے کوئی تین ماہ پہلے جناب کا "نامۂ مضمون شمامہ" ملا تھا، اور خوب یاد ہے کہ میں نے اس کے جواب میں ایک کارڈ اپنے ہاں کے ڈاکخانہ میں بقلم خود جا کر ڈالا تھا، اب اگر وہ آپ کو نہ ملا یا آپ نے اس کا جواب نہ دیا تو یہ جھگڑا تو ہم آپ طے کر لیں گے عاقبت میں، اب تو قصہ یہ ہے کہ "صدائے نسواں" مجھے برابر مل رہا ہے، اور آج یہ تیسرا نمبر ملا، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر رسالہ چار اُوپر ساٹھ صفحات کا ہوتا ہے تو کُل صفحات کا شمار ہوا "چوسٹھ تیئے ایک سو انیس" گویا مجھ سے مضمون حاصل کرنے کے لئے ہر ماہ آپ کی جانب سے میرے نام ۶۴ صفحات کا مطبوعہ خط آیا کرتا ہے، جو اب بڑھ کر ۱۱۹ صفحات کا ہو چکا، مگر اس پر بھی میری بے رخی، بے مہری، بے توجہی، بے پروا مزاجی، بے اعتنائی، بے مروتی اور بے وفائی کا یہ عالم ہے کہ میں دُنیا جہان میں لکھتا ہوں مگر نہیں لکھتا تو آپ کے "صدائے نسواں" کے لئے۔ مگر بھائی جان اگر آپ مسلمان ہوں تو یقین کرنا

کہ یہ کچھ بھی نہیں، بلکہ میں تو اسی سیاسی تعلیم و تربیت کا مارا ہوا ہوں جس میں بتایا جاتا ہے کہ چاہے بقلم خود بھوکے مرجاؤ مگر دوسروں کو روٹی دیتے رہو، گھر میں فاقہ ہو مگر قوم کے لئے ایثار کرتے رہو، حالانکہ مکے مدینے کے اسلام میں صاف صاف لکھا ہے کہ جب اپنی حالت اچھی ہو تو دوسروں کے لیئے کچھ کرو، مگر آپ لے منشی نول کشور صاحب آنجہانی کے زمانہ کے مطابع میں چھپی ہوئی کتابوں میں لکھا دیکھا ہوگا کہ مسلمان کو تو ہر حال میں ایثار ہی سے کام لینا چاہیئے، اس لئے مجھ پر جو اسی قسم کا اثر ہے تو عرصہ سے خود کو آپ کے سامنے شرمندہ سا محسوس کرتا تھا، اور دل میں کہا کرتا تھا کہ بیچارے "صدائے نسواں" والے کس قدر شریف لوگ ہیں کہ میرے مضمون نہ لکھنے پر آج تک نہ منہ سے اف کہتے نہ اُفوہ! اور رسالے ہیں کہ برابر پہنچ رہے ہیں، خیر تو قصہ مختصر یہ کہ آج خدا کے فضل سے اس قابل ہوا ہوں کہ جناب کی خدمت میں خط لکھوں اور مضمون پھر بھی نہ لکھوں سو!

دیگر احوال یہ ہے کہ تادم تحریر ہذا یہاں پر اس طرح خیریت ہے کہ بارش شروع ہوگئی ہے گویا میرے حق میں مچھر، زکام، کھانسی، ملیریا، اور مکان کی دیواریں گرنی شروع ہوگئی ہیں، اب اگر اس طرح کی خیریت آپ کی طرف خیریت مانی جاتی ہو تو سمجھ لیجئے کہ یہاں تادمِ تحریر ہذا خیریت ہے اور خیر و عافیت آں مخزم کی درگاہ

خداوند کریم سے شب و روز نیک مطلوب، حالانکہ یہ جھوٹ کہ شب و روز نیک مطلوب
اصل قصہ یوں ہے کہ "صدائے نسواں" میں کیا میں تو "صدائے مرداں" تک میں
لکھنے کو حاضر ہوں، مگر وہ آپ کے اور میرے قبلہ مولانا شوکت علی مدظلہ چھوڑیں
جب، یعنی وہ جو سال سوا سال سے حضور ممدوح نے آپ کی آنکھوں کے سامنے
مجھے اخبار "خلافت" کے عملۂ ادارت میں جوڑ رسا دیا ہے اس وقت سے آج تک
آپ روزانہ دیکھتے ہوں گے کہ اس اخبار کے میرے ننھے میاں کی قمیص کے برابر دو
کالموں میں مجھے لکھنا پڑتا ہے، اب آپ ہی بتلائیے کہ ممدوح کے ارشاد سے انکار،
اعراض، اغماض، سرکشی، سرتابی، اور سرد مہری گویا گورنمنٹ سے بغاوت کرنے کے
برابر ہے، لہذا جب تک کہ میں نے اور آپ نے گورنمنٹ سے ڈر کر چلنے کی قسم کھائی
ہے اس وقت تک قبلہ مولانا شوکت علی مدظلہ سے بھی ڈرنا ہی پڑیگا، اور جس
دن خدانخواستہ اُن سے سرکشی کرینگے اسی دن سے خواجہ حسن نظامی صاحب کے
ہاں ڈٹ کر قوالی سنیں گے، تو اس مصروفیت سے تو میں اتنا نہیں گھبراتا، بھائی
جان گھبراتا تو ہوں میاں زکام اور نزلہ سے، جو اس موسم میں نہ غریب کو چھوڑے
نہ امیر کو، بس فرق یہ ہے کہ امیر اگر طاعون میں بھی مبتلا ہو جائیں تو اُن کے
ڈاکٹر سلامت اور نوکر اُن کیلئے بے ایمانی سے دعا کرنے کو تیار، لیکن اگر یہی زکام

مجھے آپکو ہو جائے تو حکیم کے ہاں بھی بغیر موٹر کار کے بقلم خود ہی جلیئے، اور دعاگوئی کے عوض اپنی ذاتی بیوی کا یہ طعنہ گراموفون کی طرح ہر وقت سنتے رہیئے کہ بس اتنی سی زکمیہ میں یہ حال ؟

اب آپ ہی فرمائیے کہ اس حالت میں میں مضمون لکھوں یا زکام لکھوں ؟

لہذا میں نے اس زکام میں ایک کام شروع کیا ہے اور اصل میں یہی کام تھا جس کی رنگین مصروفیت کے باعث میں جناب کو خط نہ لکھ سکا، مگر آپ کہیں گے اور فی البدیہہ کہیں گے کہ تم جھوٹ بولتے ہو جبکہ تم نے خط نہ لکھنے کا سبب اوپر کچھ اور بتایا ہے اور اب کہتے ہو کہ ایک اور کام تھا، تو جواب یہ ہے کہ میں نے عرصۂ دراز سے جھوٹ بولنا یوں شروع کر دیا ہے کہ میں نے دیکھا اور عرصۂ دراز تک دیکھا کہ آج کل کے کچھ کم سنو امیر، دولتمند اور حاکم اس درجہ خوبصورت جھوٹ بولتے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے، یعنی اگر آپکو موقع ملے تو امیروں، دولت مندوں اور حاکموں سے ملکر دیکھیئے اور خصوصیت سے کسی کام کے لئے اُن سے وعدہ لیجئے، پھر دیکھئے کتنا جھوٹا وعدہ کرینگے کہ عمر بھر آپ ان کے حق میں بددعا ہی کرتے رہیں، اسی طرح امیروں، دولت مندوں اور حاکموں کے پاس رہنے والے، جانیوالے، اور ان پر اثر رکھنے والے بھی ۹۹ فیصدی وہ سفید جھوٹ بولتے ہیں کہ چاند کی چاندنی

میں بھی وہ سفیدی نہ ہوگی، آپ ان کو یوں آزمایئے کہ جب دولتمند یا حاکم پر اُن کا
اثر ہو اس سے کسی فائدہ کی خاطر ملنے یا اس سے کچھ حاصل کرنے یا اس سے ملاقات
کے لئے اُن بااثر لوگوں سے کہئیے، یہ بڑے زور سے آپ کو یقین دلائیں گے کہ میں
کل ہی آپ کے لئے سفارش کروں گا، مگر بجائے سفارش کے یا تو یہ وہاں
چُپ رہیں گے یا اگر ان کو یہ ڈر ہوگا کہ سفارش کرنے سے کہیں آپ خود نہ طلب
کر لئے جائیں تو یہ اُلٹی آپ کی بُرائی کر دینگے اور آپ سے آکر کہدینگے کہ میں نے
بہت زور سے آپ کی سفارش کر دی ہے، مگر افسوس کہ فی الحال کوئی صورت کامیابی
کی نہیں، لیکن دُوسرا موقع آنے دیجئے میں پھر سفارش کرونگا، اب اگر ایسے لوگوں کے
جھوٹ بولنے پر آپکو یقین نہیں تو میرے سر پر دہلی کی جامع مسجد رکھ کر مجھ سے قسم
لے لیجئے کہ ہاں ایسے بااثر لوگ صرف جھوٹ ہی نہیں بولتے بلکہ آپ کا راستہ
روکنے کے لئے اپنے حاکم، اپنے دولتمند سے آپ کی بُرائی بھی کرتے ہیں، چنانچہ ایک
جگہ نہیں کوئی دس جگہ کا تجربہ تو مجھے ہے، کہ مجھ سے سفارش کا کہکر گئے اور وہاں
جاکر میرے خلاف یہ کہا کہ ملا رموزی اوّل تو بے حد حقیر، وفقیر، محتاج، مسکین اور
نفتنہ باز قسم کا انسان ہے، دُوسرے یہ کہ وہ مضمون نگار ہے، اسے قریب ہی نہ آنے
دیجئے، ورنہ خدا جانے کب آپ کیخلاف کچھ لکھدے، اور مجھ سے آکر کہا کہ میں نے

بہت زوردار الفاظ میں آپ کی سفارش کردی ہے، تو جب اُونچے لوگوں کے جھُوٹ کا یہ عالم ہو تو پھر میرے آپ کے جھُوٹ بولنے پر گورنمنٹ کونسا مارشل لا جاری کردیگی، اس لئے ہوسکے تو آپ بھی موقع بہ موقع جھوٹ بول لیا کیجئے، ورنہ میری طرح دولت مندوں سے دُور رہنا پڑیگا، اور یار لوگ پلاؤ کھاتے رہیں گے۔ لہٰذا سُن لیجئے کہ جس رنگین کام کو میں نے شروع کیا ہے وہ میری جدید سے بھی جدید رنگ کی شاعری ہے،

اب آپ گھبرائیں گے کہ یہ کیا مصیبت نازل ہوئی جو آپ ملّا رموزی سے یکایک مشاعرہ بن گئے؟ سو جواب یہ ہے کہ ہم آپ ٹھیرے ادیب، لہٰذا نثر نگاری کیساتھ شعر گوئی بھی ہمارا جزوِ عمل ہے، لیکن میں نے اپنی ایک شاعری کو ایک ایسے ضابطہ کے ساتھ شروع کیا ہے جس کی مثال آج تک کی اُردو کی شاعری پیش نہیں کرسکتی، بجز حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے کہ ان کے ہاں تو چند چیزیں جانِ شاعری ہیں، باقی کے یہ جتنے بھی شعراء اُردو ہیں ایک ایسی بھول میں مبتلا ہیں کہ معاذاللہ

اب میری شاعری کا خلاصہ سُن لیجئے، وہ یہ کہ یہ شاعری میں نے عورت ذاتوں کی حمایت اور حفاظت میں شروع کی ہے، یعنی اُردو کی شاعری نے عورت

کے خلاف جو گندہ، غلط، اور خلاف فطرت ذخیرہ جمع کیا ہے، میں نے اسکا جواب اپنی شاعری میں دیا ہے، اب یہ آپکو اس وقت معلوم ہوگا جب میرا دیوان میرے مقدمہ کیساتھ شایع ہوگا، اور انشا اللہ اسی وقت دُنیا بھر کی عورتوں کو معلوم ہوگا کہ ان کے حق میں آج تک کی اُردو شاعری کس درجہ گندہ، ناپاک اور خلاف عقل و اخلاق تھی، اور ملّا رموزی نے کتنا لاجواب جواب دیا ہے، اب آپ یہ دریافت نہ کیجئے کہ میں اس دیوان کو کب شروع کرونگا، کیونکہ دیوان تو انشا اللہ اکتوبر ۱۹۳۵ء تک تیار ہو جائیگا، رہا اس کے مطبع سے چھپ کر بازار میں ملنے کا سوال، سو یہ میری بیوی کے جہیز کے زیور پر موقوف ہے، یعنی اگر وہ نیک بخت اپنا زیور گرو رکھ کر روپیہ دینے پر راضی ہوگئی تو دیکھ لیجئے کہ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں آپ ہی کے شہر دہلی کی جمعیۃ العلماء، کا مہمان بنکر اس دیوان کو چھپوا رہا ہوں گا ورنہ پھر اخبار "خلافت بمبئی" میں بیٹھے میری غزلیں اور نظمیں ملاحظہ فرماتے رہیئے گا،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ اپنے رسالہ میں جو شذرات لکھتے ہیں، ان میں واقعاتی ملاحظات کے ساتھ ساتھ باثر اور طاقتور خطابت کیساتھ ہر ماہ عورت ذاتوں کی موجودہ تمدّنی اور اخلاقی غلط کاریوں پر وہ زنّاٹے کی ڈانٹ عطا فرمایا کیجیے،

کہ ان کے دانتوں میں پسینہ آجایا کرے، جیسا کہ میں اخبار "خلافت" میں امیروں دولت مندوں، مسلمان حاکموں اور بڑے لوگوں کو درست کرتا رہتا ہوں، یہ مقصد آپ کے رسالہ کے عام اصلاحی مضامین سے حاصل نہ ہوگا، جب تک کہ آپ بقلم خود ایسی غلط رو بہنوں کو ڈانٹ نہ دیجئے گا، اور ہاں آپ دہلی میں "گلی چوڑی والان" میں جو رہتے ہیں تو میری بیوی نمبر ۳ کے لئے آپ جو چوڑیاں ارسال فرمائیں گے وہ شکریہ کیساتھ قبول کی جائیں گی، کیونکہ باوجود انگریزی جاننے کے اس اللہ کی بندی اور مجھ اللہ کے بندے نے آج تک نہ اپنی وطنی وضع و قطع ترک کی اور نہ نماز سے ہم لوگ بھاگتے، کیونکہ یورپی وضع قطع تو وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جو دماغ کے کمزور ہوتے ہیں، بس جہاں انہوں نے کسی خود سے بڑے آدمی کو دیکھا اور فوراً اس کی نقل کرنے لگے،

جی ہاں گیہوں اور خالص گھی کا نرخ چڑھتا اترتا رہتا ہے، مگر آپ یہ تو فرمائیں کہ آپکو گیہوں کتنے اور گھی کتنا درکار ہے، بس اتنا ضرور عرض کروں گا کہ دہلی پھر دہلی ہے وہاں کی ہر چیز میں بلندی ہے، حد ہوگئی کہ جب وہاں کی بھینس تک ہاتھی کی "نور چشمی" اور وہاں کا بیل اونٹ کا لخت جگر معلوم ہوتا ہے تو پھر وہاں کے گیہوں اور گھی اے سبحان اللہ! خدا ہر مسلمان کو اور مجھے کھلائے،

اب میرے خیال میں تو آجکل کے زکام اور بخار سے محفوظ رہنے کا یہی طریقہ اچھا ہے کہ یا تو زکام شروع ہوتے ہی آدمی کسی مضبوط دیوار سے اپنا سر پھوڑ لے، یا حکیم نابینا صاحب قبلہ کے ہاں کی گولیاں کھاتا رہے، اُمید ہے کہ آپ اس تھوڑے لکھے کو بہت جان کر اپنی خیریت سے بواپسی ڈاک مطلع فرماتے رہیں گے، سب کو درجہ بدرجہ سلام!

---

(۱۳)

ایڈیٹر صاحب "مستورات" کانپور کے نام

محترم مدیر، مجلہ عزیز "مستورات" کانپور، سلام و رحمت!!

آپ کا نامۂ محترم ملا تھا، میں نے معقول معذرت پیش کر دی تھی، برادرم مولوی ابو محمد ثاقب کا گرامی نامہ ملا تھا، میں نے ٹکا سا جواب دیدیا تھا، ان دونوں کے بعد میں آج اس قابل ہوا ہوں کہ مضمون تو انشاء اللہ اب میری بیوی منبراً ہی لکھا کریں گی، میں چند سطور آپ کے رسالہ کے متعلق پیش کر دوں۔ لہٰذا، دیگر احوال یہ ہے کہ الحمد للہ تادم تحریر ہذا یہاں پر ہر طرح تو نہیں مگر ہاں

خیریت ہے اور خیر و عافیت آں محترمہ کی درگاہ خداوندکریم سے شب و روز نیک مطلوب، حاصل کلام رسالہ "مستورات" مجھے اور میری بیوی نمبر۲ کو مل رہا ہے، اب یہ ظاہر کرنا مشکل ہے کہ آپ کے رسالہ کے متعلق میری رائے زیادہ بہتر ہے یا اُن کی؟ کیونکہ اس طرح ایک ساتھ رائے کے اظہار میں خطرہ ہے کہ ہم دونوں میں خدا نہ کردہ شکر رنجی ہو جائے، بارے اتنا میں بتا سکتا ہُوں کہ اگر میں یہ لکھ دُوں کہ آپکا رسالہ نہایت عمدہ ہے، تو وہ بھی دُوسرے دن لکھ دینگی کہ آپکا رسالہ بہت ہی عمدہ ہے، کیونکہ ہزار کچھ ہو مگر وہ اللہ کی بندی ہے میری قدرداں، خیر آپ ہم میاں بیوی کو تو چھوڑیئے خدا پر اور اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا پر، اب تو معلوم کیجئے کہ میں آپ کے رسالہ سے زیادہ آپ کے اس عمل اور حوصلۂ عمل کا مداح، معترف، مقر، اور ممنون ہُوں، جو آپ اس کے اجراء و اہتمام کے سلسلہ سے ظاہر فرما رہی ہیں اور ہر آئینہ آپ کا یہ ولولۂ عمل لیٹے لیٹے گراموفون باجہ سننے والی عورتوں اور لڑکیوں کے لئے درس و موعظت ہے کہ آپ کے بیشتر اوقات قومی اصلاح و خدمت کیلئے خاص اور وقف ہیں، جیسا کہ "مستورات" میں آپ کے بقلم خود مضامین کی کثرت سے پتہ چلتا ہے اور مبارکباد قبول کیجئے کہ یہ شرف و اعزاز اور امتیاز آپکو اور صرف آپ کو حاصل ہے کہ آپ اپنا

رسالہ محض اپنی ذاتی صلاحیت کے بل پر نکال رہی ہیں ورنہ بلند طبقات کی خواتین الا ماشاء اللہ قسم کی عورتوں کو چھوڑ کر باقی کی عورتوں کے اوقات جس طرح گذرتے ہیں یا بقول سی آئی ڈی والوں کے جس طرح رائیگاں جاتے ہیں، کچھ پُوچھئے ان کو ملّا رموزی سے اور کچھ دریافت کیجئے اس کی بیوی نمبر۲ سے؟ وہ تو مجھے بھی مسلمان عورتوں کی جلد از جلد ترقی، ان کی فوری اصلاح اور ان کی اعلیٰ تعلیم و مذہبیت کا خیال یوں نہ ہوتا کہ آپ جانتی ہیں کہ مجھے ایک جلیل القدر اسلامی روزنامہ "خلافت" بمبئی کے لئے روزانہ پُورے دو کالم لکھنا پڑتا ہے اگر نہ لکھوں تو دُنیا جان سکتی ہے کہ مولانا شوکت علی قبلہ ویسے ہی کیا کم ہیں، اور اگر کسی پر غصّہ ہوں تو اُن کے غصّے کو مجھ ایسا پھولوں سے تُلنے والا آدمی کیا خاک روک سکتا ہے، اس کے بعد اور کتنے رسالے اور اخبارات ہیں جن کے لئے ملّا رموزی مضامین کی پنچکی بنا رہتا ہے، مگر وہ تو آپ دعا دیجئے میری بیوی نمبر۲ کو کہ اللہ کی اس انگریزی پڑھی ہوئی بندی نے مجھے ایک دن توجہ دلائی کہ:-

عالیجناب!

آپ نے عورتوں کی غلط کاریوں پر تو وہ کچھ لکھا ہے کہ لاریب آنیوالی نسلیں تک آپ کے لئے سراپا سپاس رہیں گی۔ مگر کچھ ان کے لئے بھی لکھئے جو نہ فقط نکو کار

و دینی علم ہیں، بلکہ اُن کے لئے بھی جو کام کرنے کی استعداد رکھتی ہیں مگر ناقدروان ملاّ رموزیوں کیوجہ سے کچھ نہیں کر سکتی ہیں، اور ادھر ہندو عورتوں کی ترقی و ہنر کا بھونچال ہے کہ صوبۂ بہار کی طرح مسلمان عورتوں کو تہ و بالا کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے، بس جناب اس صاحب فہم و فراست بیوی کا مجھے اس طرف متوجہ کرنا تھا کہ میرے سامنے آپ کا رسالہ "مستورات" آگیا اور میں نے اس رسالہ کے اس جذبہ کو بے حد توقیر و احترام کی نظر سے دیکھا کہ یہ رسالہ مسلمان خواتین کو ترقی کی دعوت دے رہا ہے، مگر مذہب محترم کے اصول پر!

کچھ شک نہیں کہ مسلمان خواہ آج ترقی کریں خواہ محرم کے بعد، وہ جب تک اپنے مذہب اور اپنی تاریخ کے اصول پر نہ چلیں گے نہ وہ ترقی کرینگے نہ میری بیوی، اب اصل خرابی تو ہے اُستادوں کی ورنہ کون مسلمان ہے جو اپنی لڑکی کو شروع میں دین کی تعلیم نہیں دلاتا، مگر خدا محفوظ رکھے یہ مولوی صاحب قسم کے بوڑھے اُستادوں سے کہ یہ اللہ کے عربی پڑھے ہوئے بنارسے جو کتاب پڑھاتے ہیں اس بُری طرح اور اس درجہ موٹی عربی کے قاعدہ سے کہ نہ لڑکا سمجھ سکتا نہ لڑکی، بس وہ تو کتاب کھولکر بیٹھ جاتے ہیں اور اندھے حافظ جی کی طرح ہل ہل کر کچھ فرماتے جاتے ہیں، اُن کی بلا سے پڑھنے والی سمجھے یا نہ سمجھے، پھر دین کے مسائل سمجھاتے

ہیں تو خالص عربی اصطلاحات ومحاورات ہیں، یعنی انھیں مثال تک اُردو کی نہیں ملتی! نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اُستادوں سے پڑھنے والا لڑکا اور پڑھنے والی لڑکی اپنے اُستاد کے مرجانے کی دعا کرتی رہتی ہے اور بعض جگہ تک تو یہ ہوا ہے کہ تیز دماغ لڑکیوں نے روزہ کی افطاری میں زہر ملا کر ایسے اُستادوں کا خاتمہ کر دیا ہے، اور خدا خدا کر کے ملا رموزی کی کوششوں سے پھانسی سے بچی ہیں، لہٰذا اب جو مسلمان عورتوں کو مذہب کی تعلیم دلائیے تو خدا کے لئے پہلے اس زمانہ اور اس روشنی کے اُستاد بھی بہم پہنچائیے، تاکہ اس زمانہ کی اولاد اصل مذہب کا رنگ قبول کر سکے اور اس میں صحیح مذہبی ذہنیت پیدا ہو، پس مبارک ہو کہ آپ کے رسالہ کے مضامین اور نظموں کا رنگ ایسا ہی ہے،

دوسرا کام اگر ہو سکے تو یہ کیجئے کہ مسلمان عورتوں کو یقین دلائیے کہ ہندو عورتیں تعلیم پا رہی ہیں، مگر اس طرح کہ جس علم کو شروع کرتی ہیں اسے تکمیل تک پہنچاتی ہیں مگر مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں یہ برابر کی خامی موجود ہے کہ ہر علم و ہر زبان کے چند حصے پڑھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ بس اب اگر ابوالفضل کا والد ہوں تو میں،، اور والدہ صاحبہ ہوں تو میں، اور مسلمان عورتوں میں خدا نے چاہا تو لاکھوں عورتیں اور کروڑوں لڑکیاں ایسی موجود ملیں گی جو نہ اُردو میں کامل، نہ انگریزی میں ماہر،

نہ فارسی میں طاق، نہ عربی میں محراب، اور پھر اس ادھورے پن پر خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی سمجھتی ہیں، اور روشن خیال بھی، اور اس طرف ہندو عورتوں کا یہ حال ہے کہ کوئی بمبئی میں ہوتا تو آل انڈیا نیشنل کانگریس کے اجلاس میں ہندو لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھتا کہ کس مستعدی اور قابلیت سے وہ اس بلند مجلس میں مردوں کے برابر کام کر رہی تھیں، کہ بس پولیس والوں ہی سے دریافت کیجئے، نتیجہ یہ ہوگا کہ دس بارہ برس میں ہندو عورتیں "ہر فن مولا" ہو جائیں گی، اور مسلمان عورتیں یا اپنے مردوں کی غلام بنی رہیں گی یا پھر اس بے راہ روی سے آزادی چاہیں گی کہ گورنمنٹ کو ان کی بندش کے لئے بنگال آرڈیننس نافذ کرنا پڑیگا،

پس مبارک ہو کہ آپ کے رسالہ کے مضامین میں علم و ہنر مندی سکھانے کا ایسا اعتدال موجود ہے جو از بسکہ مسلمان عورتوں کے مستقبل کو میری بیوی نمبر ۲ کے دماغ کی طرح آراستہ اور مہر منوّر بنا تا ہے، مگر اُفوہ! معاف کیجئے کہ میں ان باتوں میں پڑ کر اصل خط لکھنا بھول گیا، سو:-

دیگر احوال یہ ہے کہ:-

آپ کے غلام عرف ننھے میاں کے لڈو، جلیبی اور پھلوں کے روزانہ مصارف کا اب یہ حال ہے کہ اگر میرا یہ لڑکا دو چار برس اور زندہ رہ گیا تو انشاء اللہ مجھے کسی

مہاجن کے قرض میں ضرور فرق کرا کر چھوڑیگا، بھلا ایسا خرچ ہے کہ دُنیا صبح کی نماز پڑھتی ہے اور وہ جاڑے سے کانپتا ہُوا دروازہ سے باہر پیسہ لئے جلیبی والے کے انتظار میں کھڑا رہتا ہے، اب اگر اس پر اپنی بیوی نمبر ایک سے کچھ کہدیجئے تو معاملہ خُلع تک پہنچ جانے کے لئے تیار رہتا ہے، اور ویسے بھی غریب گھرانوں میں جو کام کیا جاتا ہے انتہا کے درجہ تک، یہ تو امیروں ہی میں ہوتا ہوگا کہ ہر کام سلیقہ سے ہو، کیونکہ اس میں بھی خطا غریب مردوں کی ہے جن کو نہ اولاد کی صحیح تربیت کا سلیقہ، نہ بیوی کی اصلاح کا گر معلوم، اور ملّا رموزی ان دونوں درجوں کے بیچ میں زندگی بسر کرنے والے ہیں!

خلاصہ یہ کہ وہ تو اگر بیوی نمبر ۲ کا موتیوں سے تولنے والا دماغ اور اس کی جواہر سے زیادہ قیمتی توجہات مجھے حاصل نہ ہو جاتیں تو میں اکیلے ننّھے میاں ہی کی تربیت کا گھوڑا بن کر رہ جاتا، غرض یہ کہ ہم دونوں میاں بیوی نے ملکر یہ رائے قایم کی ہے کہ آپ کے رسالہ میں جو مخرب اخلاق و نظر نصاویر نہیں تو یقیناً اسی نوع کے رسائل محمود بھی ہوں گے اور مقبول بھی، اور ظاہر ہے کہ علم و ادب اور فہم و فراست سے متعلق اگر میں نہیں تو کم سے کم میری بیوی نمبر ۲ کوئی رائے قایم کرے تو اس کے حُسن اور وزن کو تو آپ بھی تسلیم فرمائیں گے؟ پھر ادھر تو

ایک ادیب اور اُدھر اس کی بیوی مبر مہ کا بہاروں ہی بہاروں سے شاداب دماغ، اسی لئے تو میں کہا کرتا ہُوں کہ اگر یہ مہر منیر سے زیادہ غلطانیوں، لمعانیوں تابانیوں اور رخشانیوں سے بنی ہوئی بیوی میرا ساتھ دیدے تو وہ جرمنی کے تیس مارخاں جناب ہروان ہٹلر سے اگر جرمنی کا تخت نہ چھین لاؤں تو "مستورات" میں مضمون ہی نہ لکھنے دیجئے گا!

جناب والا! مسلمان عورتوں کے ترقی نہ کرنے کا بڑا سبب تو یہ ہی ہے کہ ان غریبوں کے کمالات کی صحیح داد دینے والے نہ شوہر نہ گورنمنٹ، بس یہ کہکر چھوڑ دیا ہے کہ "عورت ناقص العقل" ہوتی ہے، اور میں کہتا ہُوں کہ اگر عورت ناقص العقل ہوتی تو ہندوستان ایسے طول طویل علاقہ پر کس طرح حکومت کرتی اور گورنمنٹ کیوں کہلاتی، "گورنمنٹا" نہ مشہور ہوتا؟

بہر حال آپ کی طرف اگر خالص گھی ملتا ہو اور موٹر کاروں کا نرخ ارزاں ہو تو ایک ٹین خالص گھی کا اور ایک موٹر کار زمرد، الماس، مرجان، نیلم، یاقوت، ہیرے، جواہر اور پکھراج کی بنی ہوئی میرے نام اور روانہ کردیجئے گا، رہا معاملہ قیمت کا، تو یا تنخواہ پر لے لیجئے گا یا عاقبت میں، آخر میں عرض کروں گا کہ "مستورات" میں کشیدہ کاری کا سلسلہ بھی لائق تعریف ہے، خدا کرے

مسلمان مستورات گھر کے ہنر ہی میں طاق ہو جائیں بی اے تو جب ہونگی، ہونگی، امید ہے کہ آپ بھی بخیریت اور زکام کھانسی سے محفوظ ہونگی، اب میری اور اُن کی جانب سے تمام خورد و کلاں کو درجہ بدرجہ سلام اور پیار، مگر خدا کے لئے لفظ "تمام" سے یہ مطلب نہ لیجئے گا کہ کانپور کے لاکھوں خورد و کلاں، بلکہ صرف اپنے گھر کے، اور زیادہ سے زیادہ میرے محترم خان بہادر حافظ محمد حلیم صاحب اور ان کے خلف ارشد محمد بشیر صاحب بی اے، بی کام بار ایٹ لا کے خورد و کلاں کو سلام و دعا۔

---

(۱۴۰)

ایڈیٹر صاحب "مستورات" کانپور کے نام

بھائی احسن عثمانی کو بعد سلام سنت اسلام کے از طرف ملّا رموزی معلوم ہو کہ یہاں پر سب طرح خیریت ہے، صرف اس نیک بخت کو کھانسی زکام کی شکایت ہے، اور میرے اس اکلوتے بیٹے کی آنکھیں آشوب کر آئی ہیں، جس عزیز کو میں نے پچھلے سال اپنی بیوی نمبر ۲ کی خیریت سے آمد پر صدقہ کا بکرا بنا دیا تھا، وہ غریب بال بال بچ گیا اور اس اللہ کی بندی نے شکریہ تک ادا نہ کیا، بچہ کو بلا کر پیار کرنا کیسا؟

اور خیر و عافیت آں محترم کی درگاہ رب العزت سے شب و روز نیک مطلوب

دیگر احوال یہ ہے کہ خط آپ کا آیا، آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، مگر یہ معلوم کر کے "از حد فکر" ہوئی کہ میرا بھیجا ہوا مضمون جناب کو نہیں ملا، حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اخباری کام کا جتنا بڑا بھاڑ میں جھونکتا رہتا ہوں اس کی وجہ سے میرے پاس اتنی زیادہ ڈاک آتی ہے گویا میں ملازمت کے عوض صدر ڈاکخانہ بن جاتا ہوں اور جس وقت میں اپنی ڈاک ڈاکخانہ سے خود وصول کرتا ہوں تو اس وقت اچھا خاصا ڈاکیہ معلوم ہوتا ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ میری ڈاک کا بھی وہ بندوبست ہے جو یا تو وائسرائے ہند کی ڈاک کا ہوگا یا پھر میرا، اس لئے میرے گھر کے ڈاکخانہ سے لیکر مرکزی ڈاکخانہ تک کے ملازمین میری ڈاک کے بندوبست میں یوں مستعد نظر آتے ہیں جس طرح بعض مسلمان لڑکیاں نماز سے پہلے سینما کے تماشے کے لئے مستعد نظر آتی ہیں، اس لئے کہ جہاں میرا ایک کارڈ بھی ادھر سے اُدھر ہوا کہ میں نے تمام ڈاکخانوں سے جنگ شروع کر دی، اور یہ دُنیا جانتی ہے کہ میں جس کے پیچھے پڑ جاؤں یا اس کو ختم یا پھر خود پھانسی پر لٹکنے کو تیار رہتا ہوں، وہ تو کہیئے کہ میں بیوی نمبر ۲ کے معاملہ میں کمال صبر سے کام لے رہا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ آخر وہ غرور اور خموشی سے کب تک کام لیتی ہے؟

دیگر احوال یہ ہے کہ:۔

میں نے جو مضمون جناب والا کو روانہ کیا تھا، اس میں یہ لکھا تھا کہ میں اب عورتوں کے معاملات پر مضمون لکھنا چھوڑ چکا ہوں، وہ اس لئے کہ ابھی ہندوستان میں عورت ذات بہ لحاظ تعلیم و تربیت بہت پیچھے ہے، اس لئے اس میں علمی اور اصلاحی خصوصاً طنزیہ مضامین کے سمجھنے کی لیاقت پیدا نہیں ہوئی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ میرے تمام اصلاحی مضامین کو عورتوں نے تو خیر سمجھا جیسا کچھ سمجھا، مگر جناب لڑکیوں نے صرف یہ سمجھا کہ ملا رموزی جو کچھ لکھتا ہے وہ صرف عورتوں کے خلاف لکھتا ہے یا دولت والوں کے خلاف لکھتا ہے، بس جناب یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پھول سے زیادہ نازک دل ٹوٹ گیا، وہ تو خدا مہر معاف کرنے کی توفیق دے میرے ننھے میاں کی والدہ کو، کہ اس غریب نے فوراً اس کو جوڑ دیا، ورنہ آج میں یہ چند سطور بھی مارے تاؤ کے نہ لکھتا، اور لکھوں تو کیسے کہ آج ۲۰ بیس برس سے لکھ رہا ہوں اور آپ کو بھی قسم دیتا ہوں کہ آپ ہی بتائیے کہ میں نے کس عورت کے خلاف لکھا اور کس کا بھانڈا پھوڑا، بجز اس کے کہ جو لکھتا ہوں عام عورتوں کی اصلاح کیلئے لکھتا ہوں، مگر وہ نیک بخت یہی سمجھتی ہے کہ اگر ملا رموزی سے بات کی تو فوراً یہ مضمون میں لکھدیگا، لہٰذا جب اس کی کم عقلی کا یہ حال ہے، تو ایسی مضمون نگاری کو دور سے بھی سلام، اور

قریب سے بھی سلام، بیشک میں جانتا ہوں کہ میرے خلاف اس کے گھر کے معتبر نائی نے بہت کچھ کہا ہے، حالانکہ یہ اس کا معتبر نائی باہر آ کر خود اس کی بُرائیاں اور عیب بیان کرتا ہے، مگر اس کو یہ کون بتائے کہ تُو جس معتبر نائی پر بھروسہ کرتی ہے وہ باہر سے تیرے خاندان بھر کا مخالف ہے، اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ اچھا اس کو خموش ہی رہنے دو، ایک دن تو سچ کا اثر ہو کر ہی رہیگا، لہٰذا یہ سوچکر میں نے "عورتانہ مضمون نگاری" بند کر دی ہے، اللہ ہم کو تم کو معاف فرمائے، اور اس کے عوض یہ کام کیا کہ اب شاعری کر رہا ہوں، شاعری کے ذریعہ بھی عورتوں کی ایک بڑی بھاری خدمت کرنا چاہتا ہوں، وہ اس طرح کہ اُردو میں آج تک کی غزل کی شاعری نے عورت کے کردار کو بے وفا، مکار، عیار، غدار اور خاصا آوارہ اور ظالم و جابر قرار دیا ہے، لیکن میں نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں عورت کے فطری جذبات، وفادارانہ رجحان اور طبعی واردات کو اس طرح پیش کیا ہے، جس طرح کہ ان کو پیش ہونا چاہئے!

دیگر احوال یہ ہے کہ جو عورتیں کہ اپنے گھر کے ملازم پر کامل بھروسہ کر کے دُوسروں کی نہیں سنتی ہیں وہ آخر کار نقصان پاتی ہیں، کیونکہ جو ملازم زیادہ اعتبار کے قابل سمجھا جانے لگتا ہے وہی دھوکے بھی بہت دیتا ہے، اسی لئے انگریز لوگ

ہر نوکری پر ایک آدمی کو صرف پانچ برس رکھتے ہیں، اور اسکو بدل دیتے ہیں، میں یہ کب کہتا ہوں کہ عورتوں کو آزادی نہ دیجئے، مگر کیا ایسی آزادی دیدی جائے کہ ہر گلی کوچہ سے ان کے نام پر لعنت کی آوازیں آئیں!

بھائی جان! حال یہ ہے کہ اوّل تو تعلیم ہی نہیں، دوسرے تعلیم تعلیم جس کو کہا جاتا ہے وہ صرف اتنی ہوتی ہے کہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بول لی اور غنڈوں کی قسم کی اردو لکھ لی، نہ "پانیر" کا کوئی علمی مضمون سمجھ سکیں نہ اونچے درجہ کی اردو میں صحیح خط لکھ سکتی ہیں، ایک دو قسم کے کیک بسکٹ بنانا سیکھ لیا، کم علم اور کم تجربہ عورتوں کے کلب میں دو چار ہاتھ انگریزی پٹے کے دکھادیئے، اور آزادی طلب فرمانے لگیں اعلیٰ تعلیم یافتہ مردوں کے برابر، ہاں بے شبہ جو عورتیں عمر کی پختگی کو پہنچکر اعلیٰ تعلیم وہنرمندی کا ثبوت دیں، ان کے لئے میں یہاں تک تیار ہوں کہ وہ پردہ سے باہر آکر کام کریں، اور میں پردہ نشین بن جاؤں، لیکن اگر نوعمری اور ناکتخدائی کے زمانہ میں سنہری، روپہلی گھڑی، ڈانس، ہارمونیم، سینما اور گھوڑ دوڑ میں حصہ لینا چاہیں تو میری تو رائے نہیں، ہاں آپ کی رائے سے مجبور ہوں اور یہ تو اب جانے ہی دیجئے کہ فلاں مدرسہ میں اعلیٰ مذہبی تعلیم دی جاتی ہے، ارے بھئی جب خاندان بھر کا رنگ مذہبی نہیں تو لڑکی تعلیم پاکر کیا خاک کر سکتی ہے، اسی لئے

کتنے کمبخت اور منحوس گھرانے ہیں جن میں شادی بیاہ کے لئے دولت مند لڑکی اور دولت مند لڑکا تلاش کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اسی تلاش میں ہزاروں نقصانات پہنچ جاتے ہیں، اِدھر فطری قاعدہ سے جو لڑکی دولتمند سے بیاہی جائیگی وہ اس لئے سُکھ نہ پائیگی کہ اس کے میاں دولت کیوجہ سے شرابی ہوں گے اور کبابی بھی، پھر جتنی خوبصورت لڑکی ہوگی اتنے ہی خوبصورت میاں ہونگے، ایسی صورت میں خوبصورت شوہر خوبصورت بیوی کی کیا قدر کریگا؟

دیگر احوال یہ ہے کہ اگر آپ کے اور محترم بیگم صاحبہ کے سامنے میرا یہ خط پڑھا جائے تو اس تھوڑے لکھے کو بہت سمجھئے گا اور چمڑے والے تاجروں سے زیادہ میل جول رکھئے گا یہ حضرات قومی کاموں میں خاصی دولت صرف کرتے ہیں مجھے تو الحمدللہ ضرورت نہیں، والسلام!

۱۵

ایڈیٹر صاحب "مسیحا" رامپور کے نام

محترم مدیرو مہر دبیر "مسیحا" ادام اللہ دواخانہ، وشفاخانہ!

بعد دعائے ترقی درجات مطب وادویہ کے التماس ہے کہ خطوط آپ کے ملے

حالات سے آگاہی ہوئی، الحمدللہ تادم تحریر ہذا یہاں پر خیریت کے قسم کی ایک چیز ہے، تو مگر نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیریت ہے یا غیر خیریت، یعنی اگر صبح سے شام تک کم علم، بے ذوق، کم نظر، کم ظرف، ناقدردان، حاسد، منافق، اور در پردہ سخت مخالف دوستوں میں رہنے کا نام خیریت ہے تو بیشک میرے گھر میں ہر طرح خیریت ہے، اور خیر و عافیت آں محترم کی مع خورد و کلاں کے درگاہ الٰہی سے شب و روز نیک مطلوب، اور جو خیریت اس کا نام ہے کہ ایک فردوس نظر کوٹھی ہو، ایک رولز رائیس کار ہو، ایک ذخیرہ شراب ہو، ایک جنت نہیں تو ناز بردار حور ہو، ایک ہمدرد حلقۂ احباب ہو، ایک صاحب ذوق و فراست حلقۂ خطاب و عمل ہو، ایک دارالاشاعت ہو، ایک ذاتی مطبع ہو، ایک اخبار اور ایک رسالہ ہو، ایک آزاد اور ایماندار قلم ہو، تو اس حساب سے الحمدللہ اپنے خواجہ حسن نظامی مدظلہٗ کے ہاں خیریت ہے، اور بس، ہاں میرے ہاں تو ایک پرانے قبرستان میں تین سو تین سو روپیہ کا مکان ہے، جس میں مل کے مزدور بھی رہیں تو روتے ہی رہیں، دن رات روزی کمانے اور اس میں اضافہ کی فکر ہے، اولاد ہے کہ طوفان کی طرح امنڈی چلی آ رہی ہے، بیوی نمبر ۲ کی بے مہری، بے وفائی، بے توجہی کا غم علیحدہ، نہ مضمون نگاری میں کوئی معاون، نہ غزل

صاف کرنے کے لئے کوئی منشی، ان حالات میں مسلمانانِ ہند کا تقاضا ہے کہ ان کو ہنساتا ہی رہوں اور وہ بھی مفت، تو سُن لیجئے کہ اس مرتبہ بقر عید کی نماز پڑھ کر میں نے مسلمانوں کی دماغی خدمت سے توبہ کر کے ہندوؤں کی خدمت گذاری کی قسم کھالی ہے، کہ ان کے ہاں کسی آشرم اور بھنڈار میں بھی جا رہونگا تو یہ لوگ مجھے اتنی جوانیاں دیدینگے کہ میں پھر کچھ دن اس بوڑھے ہندوستان کو باغ و بہار بناتا رہوں، حد ہے کہ میں پہلے سنا کرتا تھا کہ عورت ذات بڑی قدردان، فیاض اور ہمدرد ہوتی ہے، اس لئے میں نے مردوں کو چھوڑ کر عورتوں کی خدمت شروع کی، مگر صلہ یہ پایا کہ ان میں میرے خلاف جذبہ پیدا ہو گیا اور آج تمام دُنیا کی عورتیں ہیں کہ میرے خلاف اُدھار کھائے بیٹھی ہیں، محض اس لئے کہ میں ان کی غیر اخلاقی کمزوریوں کو کیوں بیان کرتا ہوں، اب بتائیے ایسے حالات میں "مسیحا" کے لئے کیسے مضمون لکھوں، اور وہ بھی مسلسل، تو میں عرض کروں کہ اب کچھ دن آپ مجھے بلا رموزی کے عوض ایک ماہوار رسالہ سمجھ لیجئے، اور میرے اندر شائع ہونے کے لئے ایک مضمون لکھ دیا کیجئے، اللہ بھی اجر دیگا اور میں بھی، شکر گذار ہوں گا، بھلا ظلم نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ مضمون کے لئے مجھے خط پر خط بھیجتے رہیں مگر نہیں بھیجتے تو خمیرہ مروارید، حب جواہر، اور یاقوتی، ارے بھئی جلانے دو کچھ تیز اور

طاؤس ہی ذبح کرکے بھیجدیا کیجئے تاکہ میرے دل و دماغ کی جوانی قایم رہے، کیونکہ مسلمانوں میں دماغ و دل کی جوانی کے تمام مواقع او محرکات یا تو مکروہ، معیوب، غیر مباح قرار دیدیئے گئے ہیں، یا غیر شائستہ اور مخرب اخلاق کہے جاتے ہیں، حالانکہ جوانی انہیں اعمال و محرکات میں ہے جن کو جماعت نے مکروہ اور غیر شائستہ قرار دیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ نقب زنی اچھی چیز ہے اور شراب نوشی میں دل و دماغ کی جوانی ہے، مگر ہاں جس قوم میں عشق و محبت کی زندگی، نہ ہو، اور شائستہ محبت کے مواقع بند ہوں، اس میں نہ زندگی ہو سکتی نہ خوش فکری و خوش ذوقی، جس جماعت کی شعری زندگی اور شاعرانہ تخئیل افسردہ، ناکام اور ہجر و فراق کے جذبات سے آگے نہ جا سکی ہو، جس کے شعراء کے تخلص یاس، حسرت، زخمی، وحشی، مجنوں ہوں، اس قوم میں زندگی، جوانی، اُمنگ، ترنگ، مستی، سرجوشی کہاں سے آئیگی، جس قوم کے شعراء دفتروں کے محرر، چھٹی جماعت تک کے تعلیم یافتہ، اور منشی جی قسم کے بوڑھے ہوں، اس میں بلند نظری، اور ذوق سلیم کے عوض رات دن آہ و زاری، گریہ و فغاں کے سوا اور کیا ہوگا؟

دیگر احوال یہ ہے کہ میں جس وقت یہ مضمون لکھ رہا ہوں، اس وقت میرے دماغ پر بقرعید کے اثرات ہیں، یعنی مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا تہوار ہے، مگر عالم یہ ہے

کہ عید کے تیسرے دن سے جس مسلمان کو دیکھئے اتنا خشک، اتنا متین، اتنا سنجیدہ اور اتنا فکر مند ہو جاتا ہے، گویا اس کے خاندان میں کبھی کوئی خوشی آئی ہی نہ تھی، وہ جو عید کے دن مبارک سلامت کے معانقے ہوتے ہیں، اگر تیسرے دن کے بعد کوئی معانقہ کرے تو گدھا سمجھا جاتا ہے، پس جس قوم کے تہوار بھی اس درجہ افسردہ ہو کر منائے جاتے ہوں، اس کے ہاں محنت، جفاکشی، بہادری، عالی حوصلگی اور فیاضی نہ ہوگی کہ یہ تمام قوتیں مسرت، خوش دلی، خوش فکری اور دماغ کی جوانی سے پیدا ہوتی ہیں، اچھا تو اب آپ اس قوم کی اصلاح یوں کیجئے کہ اپنے ہاں آنے والے مریضوں کا نسخہ یوں لکھا کیجئے:۔

ھُوَالشَّافِی

گاؤزبان، عناب، تخم خطمی، عشق و محبت، ظرافت، گل نیلوفر، بنفشہ تفریح، مذاق دل لگی، شربت بزوری، خوش لباسی، قہقہہ، روزانہ غسل، تخم کاہو،

شب در آب تر کردہ صباح مالیدہ صاف نمودہ بنوشند،

پس اگر آپ نے اس افسردہ، مایوس، متین، اور سنجیدہ قید کے مریضوں کو یہ مجرب، مقوی اور مبہی "نسخہ بیس برس پلا دیا تو پھر دیکھ لیجئے گا کہ اس کے زندہ رہنے، طویل عمر پانے اور محنت، برداشت کرنے کی بے شمار قوتیں بیدار ہو جائیں گی، اور ہاں

آخر میں ذیل کا پرہیز بھی لکھ دیجئے گا، یعنی ہر مریض ان اشیاء سے ڈرتا رہے :-

"تیل، ترشی، ہر قسم کی دال، بدصورت بیوی، مفلس سسرال،
تاریک مکان، گندہ ہوا، آجکل کی اردو کی غزل، رلانے والی
قومی نظم، کمزور جانور کا گوشت، امیر لوگوں کے معتبر ملازمین،
اور خدام، اور موٹر ڈرائیور، ہر قسم کے پرائیویٹ سیکرٹری،
اور خاندان کے بڑے بوڑھوں سے !"

پس جو مریض، ان چیزوں سے پرہیز کرینگے، ان کی صحت ہمیشہ جوان رہیگی،

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے رسالہ "مسیحا" کو جس جذبہ سے نکالا ہے، خدا اس میں برکت عطا فرمائے، بس ایک بات غلط کی، یعنی جن لوگوں نے آپ کے رسالہ پر اعتراضات کئے اُن کا جواب دیا، یہ بہت بڑا سہو ہے، خطا ہے، اور گناہ ہے، کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستانی لوگ ہیں غلام، اور غلامی کے خواص یہ ہوتے ہیں، پست خیالی، کم ظرفی، تنگ دلی، بغض و کینہ، حسد، اور عیب جوئی، یہی وہ خواص ہیں جن کی وجہ سے آج ملا رموزی ایسا قوم کو ہر وقت ہنسانے اور جوان رکھنے والا انشاء پرداز مالی تباہیوں سے برباد ہو رہا ہے، محض اس لئے کہ قوم کی فطرت غیر فیاض اور غیر حوصلہ مند ہے، اس لئے آپ یہ مذکورۂ بالا نسخہ ضرور

پلاتے رہیئے، مجھے تو میرا وہ عشق کافی ہے جو غزل بن کر سارے ہندوستان کو جوان بنا رہا ہے، اور اردو سے رُلانے والی غزلوں کو تباہ کر رہا ہے، اُمید ہے کہ آپ محترم بعافیت ہوں گے، ہاں بھئی! اگر آپ کو شکار کا شوق ہو تو پچاس ساٹھ طاؤس مار کر مجھے روزانہ بھیج دیا کیجئے، مجھے اُن کے گوشت سے عشق ہے، مگر الحمدللہ تمام عمر میں دو چار مرتبہ سے زائد کبھی نصیب نہیں ہوا،

ہو سکے تو وہاں کے تمام شکاری بھائیوں سے میرا درجہ بدرجہ سلام کہہ دیجئے گا، شاید اُن میں کوئی بامروت اور فیاض شکاری نکل آئے، آئندہ جو رائے عالی ہو تعمیل کی جائے، اب مضمون کی طرف سے اطمینان رکھیے، بچوں کو پیار!

(۱۶)

ایڈیٹر صاحب "خیام" لاہور کے نام

دل نواز، دل پسند، دلچسپ، دل کشا، دلربا، دلگیر اور دل خوش کُن صورت کے کاغذی غلاف میں "خیام" کا "سال تمام کُن نمبر" ملا، ڈاکخانہ کے قاعدے کے موافق اس غلاف کا مُنہ کُھلا ہوا تھا، اس لئے راستہ میں بڑی آسانی سے اس کو کسی نے چُرا لیا، جس سے یقین ہے کہ اسی طرح آپ کے کئی پرچے چوری گئے ہونگے، اس قسم کی

چوری اوپر چوں میں بھی ہوتی ہے جس کی شکایات ڈاکخانوں میں بھی ہوئیں، اور مضامین کے ذریعہ بھی ظاہر کی گئیں، لیکن یار لوگ باز نہیں آتے، اب اس چوری کے اسباب یہ ہیں کہ ہندوستانیوں میں منشی جی کے درجہ تک تعلیم ہے اور تعلیم بھی اتنی کم ہے کہ دماغ بھی نقشہ نویسی، قانونگوئی، عرضی نویس، خزانچی، تحویلداری، ناکہ داری اور کمپاؤنڈری سے اونچا نہیں ہوسکتا، لہذا ایسی چوری اونچی تعلیم کے لوگ نہیں کرتے، اور جو کہیں اونچی تعلیم کے لوگ بھی ایسی چوری میں مبتلا نظر آئیں تو تاڑ جائیے کہ ہندوستان میں گیہوں، چاول چاہے کتنے پیدا ہوں مگر ہندوستانیوں میں فاتح قوم کا لباس اور طرز زندگی اختیار کرنے سے کافی افلاس موجود ہے، بھلا جب ایک ہندوستانی سو روپیہ ماہوار پر پچاس روپیہ کا سوٹ پہنے گا اور بال بچوں کو بھی پالیگا، تو اس کے پاس بھاری نمبر خرید نے کے دام کہاں سے آئینگے، ؟ اس لئے رسالوں، اخباروں اور کتابوں کے چوروں کو بُرا نہ کہئے، بلکہ اس جدید تعلیم و تربیت کو بُرا اور ناقص کہئے جو غیر ملکی زندگی اختیار کرنے پر مستعد بناتی ہے اور یورپین تمدن کے باعث غلامی زدہ ہندوستانیوں میں فارغ البالی کا نام تک نہیں، اب طرفہ مصیبت یہ کہ ہندوستانی اسی قلیل آمدنی پر گرمی میں پہاڑوں پر رہنے، چشمہ لگانے اور نازک اور حسین گھڑی باندھنے پر حریص ہوتے جارہے ہیں، اب ذرا اور انتظار

کیجئے کیونکہ عورتوں کی ایک فوج اور تیار ہورہی ہے، جب یہ برسر کار آجائیگی تو ہندوستان کے اقلاس میں چار تو کیا آٹھ چاند دُور سے نظر آئیں گے، کیونکہ تنخواہ کا مقرر کرنا تو ہر حال میں افسروں ہی کے اختیار میں ہوگا، اور وہ بی اے پاس ہندوستانی ہی نہیں جو تنخواہ سے زیادہ خرچ نہ کرے،

مجھے اس معاملہ میں ہندو بھائیوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی بے حد پسند ہے اور سچ پوچھئے تو کسی زمانہ میں یہ زندگی مسلمانوں کی تھی، یعنی کھادی اور کھدر کا سادہ لباس، روزانہ غسل اور سادہ غذا، مگر آج ہندو قوم لباس اور خوراک سے کئی کروڑ روپیہ نقد بچارہی ہے اور بینکوں میں جتنا روپیہ ہندو بھائیوں کا جمع ہے بدنصیب اور بے عقل مسلمانوں کا نہیں، اسی لئے مسلمان کا ہر کام چندہ سے ہوتا ہے، مگر ان کو شرم نہیں کہ وہ چندہ کے رسمی لفظ سے صحیح معنی کا بھکاری اور گداگری پیشہ انسان بن رہا ہے، دوسری مصیبت یہ ہے کہ اب مسلمانوں میں یہ چھٹی ساتویں جماعت کی لڑکیاں بھی غضب کی میمنی لڑکیاں بنی چلی جارہی ہیں اور بے حس، بیہوش اور بے خرد والد صاحب خوش ہیں کہ میری لڑکی "ترقی یافتہ لڑکی" اور "روشن خیال لڑکی" ہوگئی ہے، حالانکہ ترقی یافتہ" اور روشن خیال لڑکی وہ ہوتی ہے جس کے اندر لباس اور گھگھارے سے زیادہ عقل و علم ہو، اب جو "خیام" کا "سال نمام کن نمبر" آیا تو اسکے غلاف کی

رنگینی ہی سے میری منجھلی بیوی نے اسکو گھورا، مگر میں ہوں اسی بیوی کا شوہر جو مغرور و متکبر، نہ ہو جو میری قدردان ہو اور وفادار، اس لئے میری ساری ڈاک کا انتظام میں نے اپنی چھوٹی بیوی کے ذمہ کر دیا ہے، چنانچہ اسی غریب نے کل شام کو روزہ افطار کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ:-

"کیا جس طرح موتمرِ فلسطین قاہرہ میں اس وقت منعقد کی گئی جب شورش پسند فلسطینی عربوں کی حجامت شروع ہو گئی، اسی طرح آپ بھی "خیام" کے "سال تمام نمبر" پر اُس وقت کچھ لکھیں گے جب اس پر لکھنے کا وقت گذر جائیگا؟"

آپ جانتے ہیں کہ میں تقریباً چھ سال سے اپنی چھوٹی بیوی کا فرمانبردار ہوں، فوراً ہی تعمیل کی، اور یہ ہی ویسے بھی رائے ہے کہ ہر دو تین بیوی والے شوہر کو چاہیئے کہ وہ کم سے کم رمضان کے مہینہ میں بیویوں کی فرمانبرداری اور ناز برداری سے منہ نہ موڑے، اب جو آپ کا یہ نمبر دیکھا تو اس کے سرورق کی تصویر نے اس کے کارکنوں کے حسنِ ذوق کی توقیر بڑھا دی، اس تصویر میں جو کچھ ہے وہ ہندوستانی پن ہے، جو حضرات کہ یورپ کی تصاویر سے اپنے پرچوں کو مزین اور منور فرماتے ہیں، وہ کم نظر لڑکوں کو چاہے خوش کرلیں مگر وہ بالغ نظر ہندوستانیوں کو خوش نہیں کر سکتے، کیونکہ جو خصوصیت اور نظر کی پسندیدگی ملکی اور وطنی چیز میں ہوتی ہے وہ

غیر ملکی میں نہیں، اسی لئے میں نے چاروں شادیاں وطن اور ملک ہی کی لڑکیوں سے کیں، ورنہ مجھے بھی فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی قدر دان لڑکیاں مل رہی تھیں، اور یہ اس لئے کہ یورپ کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، اس دُنیا کے مشہور علمی لوگوں سے شادی کرنا اپنی ذی عزت شہرت کا سبب سمجھتی ہیں، لیکن ہندوستان کی بعض فیشن اور پاؤڈر لگانے والی لڑکیاں صرف کھلنڈرے، دولتمند اور عہدہ دار شوہر کو پسند فرماتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت مند اور عہدہ دار قسم کے شوہر میں قدر دانی اور بیوی شناسی کی قابلیت تو ہوتی نہیں، وہ شادی کے چند دن بعد ہی بیوی کو طاق پر رکھ کر کراچی، مدراس، دہلی، کانپور، اور الٰہ آباد کی طرف جاکر کسی اور سے محبت شروع کر دیتا ہے، اور یہ بیٹھی گنڈے تعویذ فرماتی رہتی ہیں، اور یہ میرا تجربہ ہے کہ مر بھی جائے تو گنڈے تعویذ اور عملیات سے کچھ نہیں ہوتا، سو آپ کے "سالِ تمام نمبر" کی یہ ہندوستانی اور ایشیائی حُسن لئے ہوئے تصویر اپنے جمالِ دوشیزگی کے اعتبار سے اس درجہ بھی لطیف و جمیل ہے کہ اس پُورے ورق کو نوچ لینے کو جی چاہا، مگر وہ اللہ کی بندی سامنے ہی بیٹھی رہی، اس لئے نوچ کر، بنوا کر دیوار پر لٹکانے اور روزانہ گھورنے سے محروم رہا، اس کے بعد میں نے مولوی ماہر القادری مدظلہٗ کی نظم کو پڑھا، مولوی صاحب ممدوح کے کلام میں اُمنگ، مستی، جوانی اور

زندگی کا جوش ہے، اور آج مسلمان قوم کو اُمنگ اور جوش کی یوں ضرورت ہے کہ افلاس اور غلامی کے صدمات نے اس کی عملی کائنات کو برباد کر دیا ہے اس لئے میں غزل اور نظم کے اس کردار کو قوم اور ادب اُردو کے حق میں زہر سمجھتا ہوں، جس میں ہجر و فراق اور بے وفائی کے صدمات کی آہیں اور فریادیں ہوں اور ہجر و فراق کا پرانا غزلی کردار عقلاً اور فطرتاً بھی غلط ہے، یعنی اگر ایک مرد ایک صحیح الدماغ عورت سے محبت کا اظہار کرے، تو یہ عورت کی فطرت ہی نہیں کہ محبت کرنے والے کو کوتوالی میں بند کرا دے، اور رقیبوں کے ساتھ سینما کا تماشہ دیکھتی رہے، اور محبت کرنے والا حوالات میں بیٹھا ہجر و فراق اور درد و گداز کے اشعار کہتا رہے، یہ کردار تو اس وقت کا ہے جب ہندوستان میں ریل گاڑی نہیں تھی، اس لئے ملاقاتیں محال تھیں،

افسانہ نگاری کے عنوان سے میں یوں گھبراتا ہوں کہ اُردو کی بدقسمتی سے آجکل اُردو کے چند پرچوں میں وہی اہل قلم زیادہ ہیں جو ہنوز بقلم خود صاحبزادے دھرے ہوئے ہیں، اس لئے ان کے افسانوں میں زیادہ حصہ یورپی تراجم کا ہوتا ہے، جو ہندوستانی فطرت و مزاج اور آداب عشق و محبت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا، اور جو طبعزاد افسانے تحریر فرمائے جاتے ہیں اُن میں نوجوان ہونے کی وجہ سے

حسن و عشق کے فطری اور نازک جذبات، خواص اور واردات نہیں دکھا سکتے، ایسے نو عمروں اور نوخیزوں کے افسانوں کی کل کائنات صرف کالج کی لڑکی اور کالج کا لندن رسیدہ لڑکا ہوتا ہے، ایک کوٹھی، پائیں باغ، سینما میں ملاقات، اور لاحول ولا قوۃ، ہاں میرے دیرینہ ملاقاتی منشی پیارے لال شاکر عرف "پلشم" کا افسانہ صحیح افسانہ ہے، اس میں ہندوستانی خواص و حقائق کا جو ذخیرہ ہے وہ اپنی جگہ فٹ ہے، اور ویسے تمام مضامین اور افسانے صحیح اور لاجواب ہیں، جن کی بڑی مقدار آپ نے غضب کی محنت سے اس نمبر میں جمع کر دی ہے،

میں جن مضامین میں کھو گیا وہ اس نمبر کے سیاسی اور بین الاقوامی معلومات لئے ہوئے مضامین ہیں، عمر خیام کی تصویر جس میں اس کی محبوبہ سو رہی ہے، اس درجہ قابل قدر ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ہندوستان کی تمام محبوبہ نام کی لڑکیوں کو بس اسی طرح دیکھا جائے جس طرح اس تصویر میں دکھایا گیا ہے، یعنی سب کو سُلا دیا جائے، خاص کمال یہ ہے کہ آپ نے ایک ہفتہ وار اخبار کا سال تمام نمبر اس اہتمام سے شائع کیا ہے جو ایک ماہانہ رسالہ کا سال تمام نمبر بھی ہو سکتا ہے اور نظم اور مضامین کی کثرت سے یہ نمبر ایک مستقل کتاب بھی ہے، اب سوال ہے اس کی خریداری کا، سو قیمت بھی آپ نے کلھم اجمعین آٹھ آنہ رکھی ہے، الا ابلیس!

خاص الخاص خوبی اس کی بے حد روشن لکھائی، چھپائی، حسین کاغذ صاف اور روشن تصاویر ہیں، اس پر بھی اگر کوئی نہ خریدے تو خدا کرے اس کے گھر میں آٹھ آنہ سے زیادہ رقم کی چوری ہوجائے، اور چور نہ کوتوال کے ہاتھ آئے اور نہ عامل کریم الدین صاحب عملیاتی کے،

اب اس سے زیادہ میں اس نمبر پر یوں نہیں لکھتا کہ جب سب کچھ ملا رموزی ہی لکھ دیگا تو خریدار کیا پڑھیں گے؟ البتہ اتنا ضرور لکھنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی طرف کے مسلمانوں کے کان کھول کر کہہ دیجئے، خاصکر اُن سے کہدیجئے، جو وزنی عمامے باندھ کر، عبا پہنکر وعظ کہتے ہیں، نماز پڑھاتے ہیں، خطبہ پڑھتے ہیں، اخبار چھاپتے ہیں یا لیڈری کرتے ہیں، کہ دیکھو بھائی رمضان میں روزہ رکھ کر دو ۲ باتوں کا لحاظ رہے، ایک تو مزاج میں غصہ، تاؤ، خفگی اور جھنجلاہٹ پیدا نہ ہو، عورتوں اور بچوں کو کھانے کو نہ دوڑو، دُوسرے عید کیلئے قیمتی لباس نہ خریدو، ورنہ جہنم کا حوض بنائے جاؤ گے، جس میں ان اطالویوں، جاپانیوں اور سوڈیٹن جرمنوں کے لئے ایندھن جلایا جائیگا، جنہوں نے فوجی قواعد کو توڑ کر بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں، بوڑھوں پر مظالم ڈھائے ہیں، اور ہاں روزہ کے بعد رات بھر کھانے اور مرغن غذاؤں اور قیمتی مقویات سے بھی منع فرما دیجئے گا، کیونکہ روزہ کا مقصد ہی معدہ کو خالی

رکھنا ہے، لبالب کرتا نہیں، والسلام!

(۱۷)

ایڈیٹر صاحب "ارمغان" دہلی کے نام

السلام علیکم، رسالہ "ارمغان" دہلی کے ایڈیٹر صاحب!

آج رسالہ "ارمغان" دہلی کے اندر رکھا ہوا آپ کا وہ خط ملا جس کی سطر سطر سے اسلامی خُلق، اسلامی انکسار، اسلامی تہذیب، اور مشرقی آداب کی دل نواز جھلک نظر آرہی تھی، اس لئے سب کام چھوڑ کر جواب دینے کو جی چاہا، مگر دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے لکھا ہے کہ رسالہ "ارمغان" دہلی پر رائے لکھو، بس اسی سے جھجک کر رہ گئے کیونکہ آجکل چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے علی گڑھ کی تعلیم، اور اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ جب کسی رسالے، اخبار یا کتاب پر رائے لکھو تو ایمان، عقل، انصاف اور دیانت کو چھوڑ کر بس یہ لکھ دو کہ سبحان اللہ، اور ہماری فطرت کچھ اس درجہ بھی "ایمان والی" واقع ہوئی ہے کہ بغیر سچ لکھے رہا نہیں جاتا، اور جب سچ لکھتے ہیں تو رائے لینے والے سے "ہندو مسلم فساد" کا خطرہ پیدا ہوتا

ہے، اور صاحب دُنیا کچھ کہے ہم اس قسم کے چھوٹے چھوٹے فسادات میں کوتوالی تک جانا اپنی توہین سمجھتے ہیں، مثلاً:-

دیگر احوال یہ ہے کہ جس خط کا آپ نے حوالہ دیا ہے، اس میں بھی یہ ہی ہوا کہ ہم نے ایمانداری سے جو کچھ لکھا تھا ایڈیٹر صاحب نے وہ تو دیا کاٹ، اور جو بے ایمانی سے لکھا تھا وہ دیا چھاپ، اور جو غلط اور خلاف واقعہ تحریریں شروع کر دیں تو پھر یہ ہمارے ساتھ چوبیس۲۴ گھنٹہ رہنے والی ننھّے میاں کی والدہ سے یہ جھگڑا کون مول لے، اور وہ سچ تو کہتی ہیں کہ جب آپ میری کمزوریوں پر لکھنے سے چوکتے نہیں تو پھر آپ کے یہ رسالے وسلسلے اور ایڈیٹر و ڈیٹر کس کھیت کی مُولی ہیں، ہاں تو دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے چونکہ بے حد شریفانہ خط لکھا ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ آنکھوں کو نُور اور دل کو سرور حاصل ہُوا،

اے صاحب! آجکل یہ صحافتِ اُردو میں جو چند "والنیٹر قسم کے ایڈیٹر" پیدا ہو گئے ہیں، تو یہ افلاطون زادے کرتے یہ ہیں کہ ہمارے نام لیکا یک اپنا اخبار یا رسالہ یُوں جاری کر دیتے ہیں کہ ہمیں براہ راست ایک کارڈ بھی نہیں لکھتے، بس صرف پرچہ جاری کر دیتے ہیں، جس کے یہ معنی ہیں کہ بس جیسے ہی کہ ہمارا پرچہ ملّا رموزی صاحب کے پاس پہنچا وہ ہاتھ جوڑ کر اسی وقت مضمون بھیج دینگے لاحول ولا قوۃ -

تو گویا آجکل ان لونڈوں کے نزدیک مضمون نگار کی بس یہ قدر و منزلت ہے کہ اسے کہ ایک خط لکھنا بھی جاگیر دینا سمجھتے ہیں، لاہور، بلند شہر، علی گڑھ، دہلی، اور وغیرہ شہروں سے بعض نہایت خوبصورت رسالے اور اخبارات ایسے آرہے ہیں جن کے ایڈیٹروں نے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا، چونکہ ایڈیٹروں کی اس حرکت کو ہم مضمون نگاروں کی توہین بالقصد بذریعہ اخبار بغیر خط بطریق تکبر سمجھتے ہیں اس لئے واللہ ایسے تمام پرچے ہم اپنے ہاں کے "اندھے حافظ جی" کو دیدیتے ہیں، جو انھیں چوک کی "طلسم ہوش رُبا والی دکان" پر لے جاکر غنڈوں سے پڑھوا کر سنتے ہیں اور اُلٹی ہمیں عمدہ عمدہ دُعائیں دے جاتے ہیں، اور واللہ کہ اگر بغیر خط کے ہمیں کوئی خزانہ بھی روانہ کردے تو ہم اس زور سے اُٹھا کر اُس کے مُنہ پر رسید کریں کہ تیس دن تک ڈاکٹر انصاری صاحب کا علاج کراتے پھریں، مگر لاحول ولا قوۃ دیکھئے بات پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اس لئے :-

دیگر احوال یہ ہے کہ :-

بس علوم اسلامی یا علوم مشرقی کی تعلیم نہ ہونے سے ہندوستانیوں کے اخلاق میں غرور، خود پسندی، بے ایمانی، خود غرضی کی جو ذلیل قوتیں پیدا ہوگئی ہیں یہ اُن ہی کا اثر ہے کہ آجکل کی دوستی میں حُسن وفا، ثبات، پختگی، ہمدردی اور احسان

وخدمت کا پتہ نہیں، اور اخباری دوستوں میں تو بجز "تجارتی دوستی" کے اور کچھ بھی نہیں، اور ہم نے تو ان اخباری دوستوں کو اتنا آزمایا ہے کہ آپ دس سال تک بھی نہیں آزما سکتے، بس یہ تو اس وقت تک کے دوست ہیں جب تک کہ آپ اُن کے پرچہ میں مفت اور کثرت سے مضامین لکھتے رہیں، تو ان لوگوں کی اسی حرکت سے اُردو میں بلند پایہ مضمون نگار پیدا نہیں ہوتے، پھر چونکہ صحافتِ اُردو پر کوئی احتساب اور نگرانی نہیں، قوم میں علم اور صحیح واقفیت اور اصول پسندی نہیں، اس لئے ہر معمولی سا مضمون نگار چند دن کی مشق کے بعد کسی اخبار یا رسالہ کا ایڈیٹر بن جاتا ہے، غرض قصہ کون کہے،

دیگر احوال یہ ہے کہ:۔

ہمیں جو بات آپ کے رسالہ میں سب سے پہلے پسند آئی، وہ آپ کا ترکی قسم کا نام ہے، یعنی "اشرف صبوحی" کیونکہ ہمارے چھوٹے بھائی کا نام بھی "صادق صبحی" ہے اور دُوسرے کا "ماجد وفقی"۔ اور یہ نام ہیں ترکی قوم کے مسلمانوں سے ملتے جُلتے اس لئے ہمیں بہت پسند ہیں، اور دیکھئے کہ ترکوں کے ناموں سے ایک بات کا پتہ چلتا ہے، وہ یہ کہ ترکوں کے جتنے نام آپ دیکھئے گا، اس قدر شاندار اور حسین ہوں گے کہ سبحان اللہ، اور اسی سے یہ نکتہ بھی ملتا ہے کہ ترکی قوم کے

تمام افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور اسی لئے ان کے بچوں کے نام نہایت علمی اور ادبی ہوا کرتے ہیں، اور ایک یہ اپنے غلام ہندوستان میں رکھے جاتے ہیں جن سے جہل اور "غنڈے پن" کی علامت نمایاں ہوتی ہے، مثلاً شیخ محمد گھسیٹا، بدھو، اچھن، مولا بخش، چنن الدین، اب غور فرمایئے کہ یہ تمام نام کس درجہ بے معنی اور مہمل ہیں، اور ایسے ہی ناموں سے اقوام و افراد کی ذہنی پستی اور جہالت کا اندازہ ہو جاتا ہے،

اس کے بعد آپ کے رسالہ کی لکھائی چھپائی پسند آئی، ...... فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ ہر نظر فریب مطالعہ سے خوش ہوتی ہے، اس رسالہ کا "قد و قامت" بھی موزوں ہے۔ ...... یہ نہیں کہ اس عہد علم و ترقی میں ایک گز لمبا، چوڑا رسالہ چھاپا جائے، پھر اس رسالہ کی تصاویر پسند آئیں اور یہ اس لئے کہ آپ نے بجائے رنڈیوں کی تصویریں چھاپنے کے مشاہیر اور ارباب کمال کی تصویریں چھاپی ہیں، اور یہ آجکل دوسرے رسالے نہایت ہی خوبصورت اور حسین عورتوں کی تصویریں چھاپتے ہیں تو ایک طرح سے بداخلاقی کے ذوق کو رواج دیتے ہیں، کیونکہ ابھی قوم کے مذاق میں اتنی بلندی اور علمیت تو ہے نہیں کہ وہ رنڈیوں ایسی رنگین اور عریاں تصویروں میں خفی نکات و اثرات کی تلاش کرے، بس اس سے ہوتا یہ ہے کہ لوگ ایسی

عریاں تصویریں رسالوں سے نکال کر دیواروں پر لٹکا دیتے ہیں، اور دن بھر انھیں کھڑے غور سے دیکھا کرتے ہیں، اور نتیجہ یہ کہ بس تھیئٹر اور سینما جانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے مگر آپ کی تصاویر سے یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا چاہتا ہے کہ میں بھی دُنیا میں حضرت مولوی نذیر احمد مرحوم کی طرح صاحب کمال وشہرت بن جاؤں، تو میری تصویر بھی اسی طرح رسالوں میں شایع ہو گی،

پھر آپ کے مضامین کی ترتیب پسند آئی کہ آپ نے چھوٹے چھوٹے مگر متعدد اور مختلف مضامین اس چھوٹے سے رسالہ میں کافی سے زیادہ جمع فرمادیئے ہیں، اور لیاقت کی بات بھی یہ ہے کہ چھوٹے مضامین میں بڑی بات کہی جائے اور آسان عبارت میں موٹا سا علمی نکتہ سمجھا دیا جائے،

پھر آپ کے ایسے عمدہ رسالہ کی اس بات سے بہت حیرت ہوئی کہ آپ فقط "مبلغ ۱۲؍" میں سال بھر تک اس رسالہ کو خریداروں تک پہنچاتے ہیں، کمال کرتے ہیں، یعنی صرف مبلغ ایک روپیہ سالانہ چندہ رکھا ہے، بھئی اگر اب بھی اسے قوم نہ خریدے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی ہندوستانیوں میں تعلیم اور معاشیات کی نکتہ سنجیوں کی خاصی کمی ہے، اماں اتنے معمولی چندہ میں تو اس رسالہ کو بنئے اور بقّال ایسے بخیل لوگ تک خریدنے پر تُل جائیں گے، پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اتنے ہی چندہ میں ہم ایسے

یا تصویر بھی بنائیں گے۔ خدا آپ کی مدد فرمائے!

پھر آپ کے رسالہ کی دو باتیں ناپسند آئیں۔ ایک یہ کہ کاتب کو تنہائی میں ڈانٹ دینا اور کہنا کہ دیکھ بھائی مسلمان آیندہ کتابت میں صحت کا کافی لحاظ رکھنا اور بعد کتابت کاپی کا مقابلہ اور پتھر پر بھی صحت کا خیال رکھنا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض مضامین کی زبان میں اغلاط ہیں اور جب مضمون میں زبان۔ محاورے۔ اور قواعد کی اغلاط رائج اور شائع ہوں گی۔ تو اس سے زبان اور ادب کو نقصان پہنچیگا اور ایسا رسالہ اصولاً ادبی رسالہ نہ کہلائے گا اور علمی کہنا تو بالکل فضول ہو جائیگا۔

باقی سب طرح خیریت ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کے رسالے اور حوصلہ کو ترقی اور حُسنِ قبول عطا فرمائے۔

دیگر احوال یہ ہے کہ آپ مضامین میں زبان اور قواعد کی اغلاط کی خود اصلاح فرما دیا کیجئے، کیونکہ رسالہ نکلتا ہے دھلی سے اور یہاں کی زبان کو بے حد صحیح ہونا چاہیئے بے ضرورت انگریزی الفاظ بھی نکال دیا کیجئے گا، اور دیکھو بھئی جو آپ کو کہیں خواجہ حسن نظامی صاحب مل جائیں تو ہمارا بہت بہت اور درجہ بدرجہ سلام کہہ دینا۔

(۱۸)

ایڈیٹر صاحب رسالہ "ارمغان" دہلی کے نام

حضرت سلامت ایڈیٹر رسالہ "ارمغان" دہلی کو بعد سلام مسنون کے معلوم ہو کہ الحمدللہ تادم تحریر ہذا یہاں پر ہر طرح خیریت ہے، صرف چار مہینہ سے تنخواہ نہیں ملی ہے، اور اسے خیریت سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے کہ ملازم رکھنے والے نے ہمارے یا آپ کے ہاتھ تو جوڑے نہ تھے کہ جناب آپ تو میری ملازمت اختیار ہی فرما لیجئے بڑا احسان ہوگا، اس لئے ملازمت کے معنی ہوئے "اپنی حماقت" اور وہ جو کہا ہے ناکہ ؎

خود کردہ را علاجے نیست!

سو اس لئے آپ کی خیریت درگاہ خداوند کریم سے "کبھی کبھی" نیک چاہتے ہیں، امید ہے کہ آپ بھی ہماری خیریت کے معاملہ میں ایسا ہی عمل فرماتے ہوں گے، کیونکہ جناب آجکل کا ہے زمانہ خود غرضی کا، دُور کیوں جاتے ہیں آپ یہ اپنی برادری کے برادران ہی کے برتاؤ کو دیکھ لیجئے۔ کیا؟ یعنی یہی اخبار نویس برادری، آجکل جس ڈھنگ سے چل رہی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے، یعنی اگر آپ مضمون نگار کی

حیثیت سے اس برادری میں داخل ہو جائیں تو یہ "اخباری برادر" آپ کے مغز کا ایک ایک حصّہ پانی کر کے اس سے اپنے اخبار کی زینت بڑھائیں گے اور ہر وقت آپکو خوشامد سے بھرے خطوط لکھنے پر تیار رہیں گے، بشرطیکہ آپ بہتر سے بہتر مضمون انھیں مفت دیتے رہیں، لیکن اگر آپ نے اُن سے معاوضہ کا مطالبہ کیا تو سمجھ لیجیئے کہ آدھی دوستی اُس وقت سے ختم، اور جو خدانخواستہ ان اخباری بھائیوں نے آپ کو "تجارتی اغراض" کے تحت معاوضہ دینا منظور کر لیا تو پھر آپ کیساتھ برتاؤ یُوں شروع ہو گا گویا آپ اُن کے ملازم اور خانساماں ہیں، اب اگر اس صورت میں آپ کی کسی سے چل جائے تو پھر ان اخباری بھائیوں کے اخبارات آپ سے مکّہ شریف تک دُور رہیں گے، آپکا کوئی ایسا مضمون ہرگز نہ شایع فرمائیں گے جس میں آپنے اپنے کسی دشمن کا توڑ کیا ہو محض اس تجارتی خوف کے تحت کہ کہیں آپ کا دشمن اُن کے اخبار کے پیچھے نہ پڑ جائے، اور جو اُن کے اخبار پر کوئی حملہ کر دے تو یہ آپکو اس کے خلاف لکھنے پر ہاتھ جوڑ جوڑ کر آمادہ کرینگے، اور خود تو اس کے خلاف ایسا لکھیں گے کہ گالیوں کا فن بھی توبہ کر لے، استغفراللہ کیا فرماتے ہیں آپ ہم اور ایسے اخبار نویسوں سے صلح کر لیں، اے صاحب بُزدل کہتا بُزدل جو کبھی آپ ہیں۔ آنکھ مار تا دیکھیں

لاحول ولا کوئی بات بھی ہے وہ تو کہئیے کہ یہ بھی خدا کا فضل ہی ہوا کہ ہمیں اس بظاہر مصلح قوم برادری کے ایسے تلخ اور منافقانہ تجربات ہو گئے اور یہ جو آپکو آج لکھ رہے تو ہیں تو کیوں ؟ بس اسی لئے کہ وقت ضرورت کام آئے اور آنیوالے سیدھے سادے نیک دل، وضعدار اور وفادار مضمون نگاروں کے دھوکہ سے محفوظ رہیں ،

صاحب عالی! بات یہ ہے کہ ہندوستان سے اب جو مذہبی تعلیم فنا ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ ہندوستانیوں کے اخلاق وخواص کو بھی بدلنا چاہئے اور دوستی، وفاداری، رواداری، اخوت، طرفداری، حمایت، وضعداری، اور جان نثاری کے جن بلند برتر جذبات کو مسلمانوں کی دینی تعلیم اُبھارتی اور بیدار رکھتی ہے، اُتنا نہ تو یہ "پانا، جانا" کی کتاب اُبھارتی ھے، اور نہ یہ "ایف اے ٹی فیٹ، فیٹ معنی موٹا" والی کتاب، کیا فرمایا آپنے "علم وادب" اے بھائی جان اُردو میں علم وادب کیسا ؟

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپکے ملک میں صحیح معنی کے عالم محقق، اور صاحب بصیرت لوگ پیدا بھی ہوتے ہیں یا نہیں، تو پھر صحافت اُردو میں علم وادب کا نام ایک طرح کا مذاق ہے، ہاں اگر آپ یورپ، ترکی، ایرانی، عراقی اور

مصری اخبارات اور رسائل کے مقابل رکھ کر پڑھیں تو پتہ چلے کہ صحافتِ اُردو میں کس حیثیت کا علم وادب پیش کیا جارہا ہے، بس صاحب خدا کا نام لیجئے، بس یُوں سمجھ لیجئے کہ صحافت اُردو میں "الفاظ کا ذخیرہ" بہت خاصا جمع کیا جارہا ہے، رہے علوم یا ٹھوس تحقیق تو اس کا وجود نہ اخباراتِ اُردو میں نہ رسائل اُردو میں، مگر اسکے اسباب ہیں چنانچہ:-

نمبر ایک یہ کہ اخبار "الہلال" کلکتہ اور رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کو ملک میں سب سے سوا اعتبار، اقتدار، اور وقعت کیوں حاصل ہے؟ بس اس لئے کہ ان پرچوں نے جو بلند مضامین پیش کیے؟ محض اس لئے کہ ان کے ایڈیٹروں نے واقعی معنیٰ کے علوم حاصل کئے اور اس طرح کہ ان علوم کی باقاعدہ تکمیل کی، پھر مطالعہ کو وسعت دی، نتیجہ یہ کہ نام پایا، بخلاف ان کے یہ پڑی ہے آپ کے سامنے ساری صحافتِ اُردو، یا اُردو کے اخبار اور رسالے، اب معلوم فرمالیجئے کہ کیسے کیسے ماشاء اللہ اور چشم بد دُور قسم کے علماء اور محققین اس میں کام کررہے ہیں؟ تو بس پھر عوام کی بدمذاقی کا رونا رونا اصولاً غلط ہے، اس لئے کہ بھائی جان عوام تو تابع ہوا کرتے ہیں خواص کے اور خواص انھیں نہیں کہتے جو موٹر کاروں میں بیٹھ کر سینما کا تماشہ دیکھنے جاتے ہیں بلکہ خواص انھیں کہا جاتا ہے جو اربابِ فضل وکمال ہوتے ہیں،

ہاں ہاں مانتے ہیں بھائی کہ اب چند دن سے صحافت اردو میں نظری انقلاب، عرف طباعتی اور کتابتی رنگینیاں پیدا ہوگئی ہیں، مگر وہ بھی اس قلت کے ساتھ کہ ابھی ان کے وجود کا اقرار کثرت کے مقابل جائز نہیں، مگر لاحول ولا قصہ کہاں سے کہاں جا پہنچا، تو ہاں ہم نے جو آپ کو عرصہ سے خط نہیں لکھا تو وہ اسی لئے کہ بھائی جان اس اللہ کی بندی نے تنگ کر رکھا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ جب کوئی اللہ کی بندی مخالف ہو جائے تو بس خدا ہی حافظ ہے، اس کے اللہ کے بندہ کا وہ یاد نہیں آپ کو کہ آخر کار وہ بے چارہ بادشاہ ایران اسی قسم کی اللہ کی بندی کے معاملہ میں پیرس میں جان گنوا بیٹھا، یہ اندور ریاست کے مہاراجہ کا معاملہ تو ابھی کل کی بات ہے، اے صاحب وہ تو جب تک شادی بیاہ میں لڑکے اور لڑکی کی ذاتی پسند اور آزادانہ انتخاب کا طریقہ رواج نہ پائیگا، اس وقت تک ۹۵ فیصدی گھرانے ایسے ہی تباہ ہوتے رہیں گے،

کیا فرمایا آپ نے اخبار نویسی کی تعلیم؟ اسے بھائی جان قسم لے لیجئے ہم سے کہ ہزار بار تو مضامین میں لکھ چکے کہ جب تک ہندوستان میں ہندوستانی کالج اور یونیورسٹی میں باقاعدہ اخبار نویسی کا نصاب جاری نہ کیا جائیگا، اخبار نویسی کا بی اے اور ایم اے نہ ہوگا ہندوستانی صحافت دنیا میں کوئی اعتبار اور اقتدار

حاصل نہ کرے گی۔ مگر خواب کہے کون اور سُنے کون ؟ کیا یہ اسمبلی کے ممبر لوگ بس جانے بھی دیجئے ان لوگوں کا قصہ خواہ مخواہ کچھ کہدیں گے تو آپ ہی ہمیں اُلٹا قائل کرنے کھڑے ہو جائیں گے۔ ارے بھئی ان کا فرض ہے کہ یہ اسمبلی میں چلّا چلّا کر کہیں کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں باقاعدہ اخبار نویسی کی تعلیم شروع کرو اور ہم "نمک" بنانا شروع کر دیں گے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں اور تو اور وہ حیدرآباد سے آتے ہوئے حضرت سلامت راس مسعود صاحب تک سے اب تک کسی نے اس بات کو نہ کہا۔ خیر وہ تو ہم ہی علی گڈھ جائیں گے تب یہ بات آگے بڑھے گی۔

لیجئے اب وُلا پھر سر پہ سوار ہیں کہ جس طرح ہو۔ میری چند باتیں سُن لیجئے اور مان لیجئے کہ دنیا کے سارے ٹیلی فونوں میں بیوی ہی ایک ایسی ٹیلیفون ہوتی ہے او رجب سناتی ہے او رجو سناتی ہے فقط یہ کہ روپیہ لاؤ روپیہ۔ خدا جانے اس طبقہ کو دنیا میں کبھی سلیقہ بھی آئے گا یا نہیں۔ بس بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مرد ہوں یا عورتیں۔ جب تک ادھوری تعلیم پائیں گے اور پائیں گی۔ ایسے ہی رہیں گے اور ایسی ہی رہیں گی۔ بس تو پھر جانے دیجئے۔ ہم ذرا اُن کی بھی سُن لیں۔ آخر کو جناب کو وہ وہی ہیں کہ کہا ہے:-

(۱۹)

ایڈیٹر صاحب "ادیب" پشاور کے نام

مجلہ "ادیب" پشاور کے تمام "عید نمبری خریداروں" کو اللہ کے لکھے پڑھے بندے ملا رموزی کی طرف سے پہلے عید کی "مبارکباد" پہنچے، پھر سلام مسنون پہنچے، اور پھر یہ "دیگر احوال" پہنچے کہ "مجلہ مصور ادیب" مجریہ شہر پشاور کا عید نمبر ملا، وہ شہر پشاور جہاں انگریزی قوم کی بہت زیادہ فوجیں رہتی ہیں اور رہتی چلی جائیں گی جب تک ہندوستان پر انگریز بھائیوں کا قبضہ ہے، پس الحق کہ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا، اور یہ اس لئے کہ شہر پشاور جسے جاہل ہندوستانی "پشور" اور افغانی لوگ "پخور" کہتے ہیں، وہ مقدس و محترم شہر ہے جہاں سے ملا رموزی کے آبائی وطن "کنٹر" واقع افغانستان کو راستہ جاتا ہے اور آپ دیکھ لینا کہ جس دن یہ ملا رموزی صاحب شہر پشاور میں پہنچ گئے اسی دن پشاور اور صوبہ سرحد کے تمام افغانی بھائی ہمارے پاس آکر کہیں گے کہ واہ ملا رموزی صاحب آپ جو سادات کنٹر کے رکن ہو کر پشاوری ہوٹل میں قیام فرمائیں اور ہم جو اپنے آبائی اور قومی وطن افغانستان کو

چھوڑ چھاڑ کر اس پشاور میں پڑے انگریزوں کی ملازمتیں کر رہے ہیں تو آخر ہمارے یہ "پشاوری غریب خانے" پھر کس کام کے، جب آپ ہمارے مہمان نہ ہوں؟ اور یہی وہ شہر پشاور ہے جس میں بوڑھوں کو جوان بنا دینے والے تازہ پھل اور میوے اگر انگریز بھائیوں کے کھا لینے سے بچ جاتے ہیں تو اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ہمیں اور آپکو ساری عمر میں بھی نہیں مل سکتے"، تو ان اعتبارات سے ہمیں اس شہر سے جو محبت ہے لندن سے بھی نہیں، اس لئے اب جو سنا کہ پشاور سے رسالہ "ادیب" جاری ہوا تو خواہ مخواہ اس سے بھی محبت شروع ہو گئی، اور یہ عام قاعدہ ہے کہ انسان کو دنیا کے جس رسالہ ادیب سے جتنی محبت زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس پر لکھتا ہے، اس لئے:-

دیگر احوال یہ ہے کہ:-

مجلہ ادبیہ "ادیب" پشاور، اپنی علمی و نظری دلفریبیوں کے ساتھ صوبہ سرحد کے باشندوں کے لئے ایک ایسی دولت ہے جس کے لئے تمام باشندگانِ سرحد کو "سجدۂ شکرانہ چاہیئے"۔ مغربی اقوام کے ہندوستان پر حکمران ہونے کے بعد یعنی آج پورے دو سو برس میں علمی و فکری ارتقاء نے ذہنی مشاغل کو وہ شباب پہنچایا ہے جو سلاطین مغلیہ کے سلسلۂ حکمرانی میں اکبر بادشاہ غازی

کے عہد میں سُنا گیا تھا، اس میں شک نہیں کہ عہد حاضر میں علم وفن کا حصول ہی ایک ذریعہ ہے نجات اور سربلندی کا، اور ایک سبب ہے علوّ و کامرانی کا، پھر ان علوم کی تحصیل جو وطنی، قومی یا مذہبی کہلاتے ہیں ایک ایسا شرف ہے جو اگر حاصل ہو جائے تو انسانی برگزیدگی بھی اسی حاصل کرنیوالے کے لئے خاص ہو سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح اس زبان کی حفاظت و ترقی اور تبلیغ و تحصیل بھی ہمارے واسطے ضروری ہے جس کے اندر ہماری تاریخ، ہماری قومی روایات اور مذہبی احکام محفوظ ہوں، پس مجلّہ مقدس "ادیب" کے مقاصد میں باشندگان سرحد کے لئے علم و فنون اور ادب و زبان کی تبلیغ و ترویج کا داخل ہونا ایک ایسا مقصد ہے جس کا احترام ہر ہندوستانی پر لازم ہے،

برادران پنجاب نے صوبۂ اودھ کے تمام "واللہ چنا چوں" پر جو فضیلت حاصل کی ہے وہ اسی لئے کہ اگرچہ پنجابی بھائیوں کی گھر کی بولی پنجابی زبان ہے مگر انہوں نے کسب فضائل کے لئے زبانِ اُردو کو اپنی مادری زبان قرار دیکر اسے یُوں آفتاب بنا دیا کہ خود آفتاب بن گئے، کیونکہ کسی غیر ملک کی زبان کو اپنی زبان بنا لینا دماغی شرف و اعزاز تو ہے لیکن خطا و ذلت نہیں، اس لئے باشندگانِ سرحد یا افغان نوجوانوں کا زبانِ اُردو کو اپنی زبان بنا لینا، ایک

ہم کیا تمام دُنیا کے "ملا رموزیوں" کے نزدیک لائق توصیف و تعریف عمل ہے۔

پس مجلہ ادبیہ "ادیب" اصل میں نشانی ہے باشندگانِ سرحد کی فکری صلاحیت اور ذہنی عروج و بیداری کی، پھر اگر گرامی منزلت برادرانِ سرحد زبان اُردو کو اسی شغف و شیفتگی کے ساتھ قبول و اختیار کرتے رہے اور اخبار "پانیر" سے محبت کم کردی تو تاریخ ہند میں ان کی عظمتیں محفوظ نا نہ ہونگی تو کیا گورکھا ملٹن کے سپاہیوں کے اشعار اس میں محفوظ کئے جائیں گے؟

کوئی شک نہیں کہ ارکانِ "ادیب" نے جس نظر نواز و دماغ آرا، اہتمام کے ساتھ "ادیب" کو جاری کیا، اس سے صوبہ سرحد کے باشندوں کے اسی بلند و برتر حوصلے کا مزید ثبوت مل گیا، جس کے لئے کبھی سرحدی بھائی صرف جرمنی کی لڑائی یا شنواری بغاوت میں مشہور ہوئے تھے،

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو اس وقت ملا رموزی صاحب کی لال رنگ کی الماری میں کوئی ایک اُوپر درجن رسالوں کے "خاص نمبر"۔ عید نمبر" اور "سالگرہ نمبر" رکھے ہوئے ہیں، جن میں سے ہر ایک بے مثل بھی ہے اور بے مثال بھی، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایڈیٹر صاحب رسالہ "ادیب" کی خوشامد میں یہ کہدیں کہ جتنا اچھا "ادیب" کا عید نمبر ہے دنیا کے کسی رسالہ کا نہیں، البتہ چند اعتبارات

ہیں جنہیں دُوسرے رسالوں کے مقابل صرف "ادیب" کے لئے یا اُس کے عید نمبر کے لئے خاص کیا جا سکتا ہے، مثلاً:-

(۱)، صرف تین ماہ کی مدّت،

(۲)، پشاور سے لیکر بمبئی اور حیدر آباد تک کے مضمون نگاروں کا اجتماع۔

(۳)، معیار ترتیب کی انتہائی بلندی،

(۴)، مصارف زیادہ اور آمدنی کم،

(۵)، کتابت وطباعت کی لاجوابی ودلفریبی،

(۶)، تصاویر کی نفاست وندرت،

(۷)، پشاور سے باہر کتابتی، طباعتی اور تصویری اہتمام اور پھر پشاور سے وقت کی پابندی،

بس اب ان باتوں کے بعد "ادیب" کو سربلند بنانے کے لئے صرف یہ رہ جاتا ہے کہ خدانخواستہ ایڈیٹر صاحب "ادیب" اپنی جان اور دیدیں ورنہ آپ ہی بتائیے کہ اور کیا رہ گیا؟

مگر لاحول ولا کہنا کیا تھا اور کیا کہہ گئے؟ تو:-

دیگر احوال یہ ہے کہ "ادیب" کا عید نمبر بابت ماہ مارچ ۱۹۳۰ء بھی ملا،

اور ہمیں کامل یقین ہے کہ پشاور سے لیکر ہمارے گھر تک کے تمام ڈاک خانے والے یا تو کہیں چلے گئے تھے اور عید نمبر خود بخود تمام ڈاکخانوں سے گذرتا ہوا ہمارے پاس پہنچ گیا، یا پھر یہ عید نمبر عین دوپہر کے وقت ہر ڈاکخانہ میں پہنچا ہوگا، اور اب جو گورنمنٹ آف انڈیا مقام شملہ پر پورے عیش کیساتھ لکھنے پڑھنے کے لئے جا رہی ہے تو دوپہر کے وقت میں "بقدرِ غنودگی" حرارت پیدا ہو گئی ہے، اس لئے ممکن ہے کہ عید نمبر کے گذرتے وقت تمام ڈاکخانے والے بیٹھے اونگھ رہے ہوں ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس دلفریب و دلنواز عید نمبر پر کسی "ڈاک خانئے" کی نظر پڑتی اور وہ اسے چُرا نہ لیتا، کیونکہ اس عید نمبر کا سرورق ہی جمالِ فطرت کی جن رنگینیوں کا نکھار بنا ہوا ہے وہی اس قابل ہے کہ ہر ڈاکخانے والا اسے اپنے پانچ روپیہ ماہوار کرایہ کے مکان میں لٹکا کر اس مکان کو "نگار خانہ چینی" بنا لیتا، اس عید نمبر کے سرورق پر فلک بوس پہاڑوں کے پاس ایک مسجد، مسجد کی بلندی پر "ہلال عید" پھر مسجد کے کنارے دریا اور دریا کے مقابل خطۂ گلزار کی شادابیاں، اور ان رنگینیوں میں ڈوبے ہوئے درختوں کی ایک شاخ پر بلبل کا جوڑا، پھر اس فردوس آفرین منظر پر شفق سُرخ اور سفیدۂ شام کی عالمتابیاں جس کمال دلفریبی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں، واللہ کہ

کسی دُوسرے رسالے کے خاص نمبر پر ایسا منظر نظر نہیں آیا، ورنہ جناب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس سرورق پر مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم کی اُردو کی پہلی کتاب کا جوار کا درخت اور باریک ہڈیوں والا آدمی بنا دیا جاتا، اس لئے اگر اس سرورق کے نقاش کو خدا کبھی وائیسرائے ہند بنائے تو ایڈیٹر صاحب آدیب" کو بھی وزیر ہند بنا دے، جنہوں نے اس منظر کے انتخاب میں سلامت ذوق اور حُسنِ نظر کا یہ دلکشا ثبوت پہنچایا۔

اس کے بعد صفحہ ۲۸ پر ایک تصویر ہے، جس کا نام ہے "آہو چشم"۔ اس تصویر سے متعلق حضرت اَظہر امرت سری کی ایک نظم ہے، اور واللہ کہ اس تصویر اور اس نظم کی صحیح داد دینا ایک خوش فکر ادیب کے بس کی بات نہیں، اسلئے کہ ان دونوں کے اندر حسن و رعنائی اور جمالِ محبوبی کی جس قدر قیامتیں پیدا کی گئی ہیں ان کے اندازہ کے لئے محترم اَظہر امرتسری ہی کی یہ موتیوں کی لڑیاں ملاحظہ ہوں ؎

لباسِ لالہ و گُل میں ہے وہ محوِ خود آرائی ! — نہاں تھا سینۂ صحرا میں جو طوفانِ زیبائی
شگفتہ پھول ہیں رقصاں ہیں موجِ امواجِ نکہت کی — کہ دامانِ شفق پر ہیں شعاعیں مہرِ فطرت کی
کھڑی ہے اک حسینہ اس بیابانِ روح افزا میں — کہ حورِ خلد ہے جلوہ نما گلزارِ دُنیا میں

ہجوم کیف سے گردش میں ہے یوں چشمِ جانانہ　　کوئی دیکھے تو جانے کر رہا ہے رقص میخانہ

سرورِ حسن جو چشمِ خمار آگیں میں پلتا ہے
پیامِ بے خودی بن کر نگاہوں سے اُبلتا ہے

اس کے بعد ایک تصویر میں چنگ و رباب اور شراب ناب کا جو جوان بنا دینے والا منظر دکھایا ہے وہ زندگی کو دنیوی فکر و الم اور رنج و افسردگی سے کچھ اس خوبی سے پاک رکھنے کی تعلیم دیتا ہے کہ جندا و مرحبا، اس تصویر میں طالب و مطلوب کو دُنیا کے آلام و علائق سے اس طرح دُور اور بے پرواہ دکھایا ہے، گویا دُنیا بس نام ہے مستی اور بے خودی اور شراب و رباب کا، باقی تمام ہندوستانی یورپ کے خریدے ہوئے گدھے ہیں اور زندگی و زندہ دلی سے منشی تلوک چند، ان سر تا سر حُسن و رنگ اور وجد و کیف تصاویر کے بعد حضرت شوکت تھانوی، میاں محمد اسلم، میر ولی اللہ اور ملّا رموزی کی تصاویر ہیں، گویا زبانِ اُردو، صحافت اُردو، ادب اُردو کے یہ "چار یار" علی بابا چالیس چور سے زیادہ اب جو مشہور ہو چکے ہیں تو اس قابل سمجھے جانے لگے کہ انھیں بھی رسالوں میں وقت ضرورت مع ٹوپی اور شیروانی کے چھاپ دیا جائے، سو چھاپ دیئے گئے، غنیمت ہے کہ رسائل اُردو اور اخبارات اُردو میں سر کھپانے والے

اور اپنے اپنے بال بچوں تک کو "خدا حافظ" کہکر لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں اب ان کی تصویریں شائع ہونے لگیں، ورنہ ایک طبقہ اب بھی ایسا زندہ ہے جس میں کے ایک نے اسی جنوری ۱۹۳۰ء کے رسالہ "زمانہ" کانپور میں وہ ۳۰۸ سنہ قبل مسیح کے میر مہدی مجروح کی تصویر چھاپ دی ہے یعنی کہ گذرے ہوئے خدام ادب کا حق ہماری ۱۹۳۰ء والی گردنوں پر برابر سوار رہے، مگر کوئی دیکھے ہم آج کل کے مضمون نگاروں کی نوکریاں، دفاتر کی حاضریاں، اور پھر ہماری مضمون نگاریاں، اور اس زمانہ کے خدام ادب کی کوئی پڑھے تاریخ میں، درباداریاں، جاگیرداریاں اور آنے جانے کے لئے اس وقت کے معارف نواز بادشاہوں کی دی ہوئی سواریاں تو جی چاہے گا کہ لاؤ اور ان آجکل کے مضمون نگاروں کے گھر موتیوں سے بھر دیں کہ کہ ان حالات پر بھی جو یہ "آج کل والے" لکھتے ہیں کمال کرتے ہیں، اس لئے ایڈیٹر صاحب "ادیب" نے جو آجکل کے مستعد ارباب قلم کی تصاویر کو عید نمبر میں جگہ دی تو حق یہ ہے کہ انہوں نے ادبا اردو کی حوصلہ افزائی کا حق ادا کر دیا، بس ان تصاویر میں اگر ایڈیٹر صاحب "ادیب" سے ہمیں کوئی شکایت ہے تو صرف اس قدر کہ اگر ملا رموزی کی تصویر کو قبلہ گاہی میر ولی اللہ صاحب مد فیوضہٗ کی تصویر کے برابر نہ چھاپا جاتا تو آپ کے عید نمبر کی خوبصورتی میں کوئی کمی رہ جاتی؟ اماں غضب خدا

کا اس فرق کو بھی محسوس نہ کیا کہ ملا رموزی قبلہ وکعبہ میر ولی اللہ صاحب کے برابر کھڑا ہو کر مضمون نگار معلوم ہوگا یا قبلہ میر صاحب کا منجھلا طو لعمرہٗ؟

نظری لحاظ سے حضرت شوکت تھانوی کی تصویر میں آجکل کے "مضمون نگارانہ فیشن" کی تمام باتیں موجود ہیں، "از قسم سر کے انگریزی بال اور موٹا سا چشمہ" تیور بتاتے ہیں کہ تصویر والا اس وقت "بالکل تصویر کھچوا رہا ہے"!

قبلہ گاہی میر ولی اللہ صاحب کی تصویر کے تیور بتاتے ہیں کہ تصویر کھچواتے وقت آپ نے سانس کے آنے جانے کی بھی ممانعت کر دی تھی،

ملا رموزی کی تصویر سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو عمر میں شاید پہلا ہی موقع ملا ہے تصویر کھچوانے کا، اس لئے بڑے شوق سے کھڑے کھچوا رہے ہیں،

میاں محمد اسلم صاحب کی تصویر کہتی ہے کہ "خیر بھائی کھینچ لو"۔ ان تصاویر کے بعد قدر قدرت ...... غازی امان اللہ خاں بادشاہِ افغانستان، فاتحین ٹل ... غازی عبدالرحمٰن مغفور، ...... شہنشاہ جہانگیر رحمۃ اللہ علیہ، خیبر ریلوے کا منظر، اور کابل کے قلعے وغیرہ ایسی تصاویر ہیں، جن سے رسالہ "ادیب" کی سرحدی اور غازیانہ نسبتیں اور خصوصیات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہیں، اور ملا رموزی کے لئے صرف یہی تصاویر قابل صد احترام و عزت یا تو اس لئے ہیں کہ یہ

ان کے وطن عزیز کے تاثرات کو بیدار کرتی ہیں، یا اس لئے عزیز ہیں کہ اُن کے دیکھنے سے اسلامی ہند کے اِن نسوانی مزاج اور نسوانی لباس والے نوجوان طلبہ میں کچھ تو حیا و غیرت پیدا ہو گی، جن کی نسوانی "فیشن ایبلیت"۔ جو سچ پوچھو تو اپنے شجاع و بہادر بزرگوں کی ناک ہی کٹوا کر رکھدی ہے، اماں سچ تو کہتے ہیں کہ یہ آج کل کے اسکولوں اور کالجوں سے جو نوجوان لونڈے نکلتے ہیں وہ نزاکت و رعنائی کی "لچکدار کمانی" ہی بنکر تو نکلتے ہیں، وہ سینے تان کر اور شانے اُبھار کر کب چلتے ہیں جو اُن کے بزرگوں کی مردانہ شان تھی۔

اب رہا عید نمبر کے مضامین کا "دیگر احوال" تو ان پر واقعی اور ایماندارانہ تنقید لکھنے کے لئے یا تو یہ کیجئے کہ اتنی دیر آپ آکر ہمارے ذمہ کے مضامین کے ڈھیر لگاتے جائیے کہ ہم اس عید نمبر کے ۱۷۰ صفحات کی نہایت باریک سطروں کے ایک ایک نقطہ کو بیٹھ کر پڑھ لیں، یا پھر آپ ان اہم علمی، ادبی، تاریخی، ناولی اور غزلی مضامین کو پڑھ کر ہمارے پاس بھیجدیجئے اور ہم ان پر تنقید لکھدیں، البتہ رسمی طور پر جو کچھ دیکھا ہے اُس کے بیان کر دینے ہی کو آپ تنقید سمجھ لیجئے اور وہ یوں ہے کہ اس عید نمبر میں حضرت مولوی اعظم حمدی سیالکوٹی کا ترجمہ "شخصیت کا اثر" ایک قیمتی چیز ہے جو "ادیب" کی آیندہ اشاعتوں میں بھی جاری رہیگا ، ترجمہ بڑی فصیح اور آسان اُردو

میں ہے، اور ترجمہ کا یہی فاضلانہ طریق ہے، بس حضرت حمدی کی جگہ ہم ہوتے تو انگریزی قسم کے ناموں کو بھی ہندوستانی ناموں سے بدل دیتے، کہ ہمارے نزدیک اُردو میں ہر ایک چیز اُردو والوں ہی کی اچھی ہوتی ہے،

حضرت تاجور ایڈیٹر رسالہ "اُدبی دُنیا" کے اشعار پر حضرت نشتر جالندھری کا تبصرہ اصولی تنقید کے لحاظ سے کہاں تک صحیح ہے، سوبجز علمی اور عروضی اعتراضات کے باقی کی عبارت میں وہی جذبہ نمایاں ہوگیا ہے، جسے تنقید سے کوئی تعلق نہیں، پھر بھی مضمون نہایت علم افزا ہے اور کام کا،

"اصلاحات شعری" اور "عرفی شیرازی" والے مضامین دماغوں میں عالمانہ نور پیدا کرنیوالے ہیں، نظموں میں حضرت اظہر امرت سری اور ایڈیٹر صاحب "ادیب" کی نظمیں شعری لطافتوں کا ایک شباب آرا ذخیرہ ہے، جو اُردو کو نصیب ہوا ہے، باقی کے مضامین اور نظموں کی لاجوابیاں آپ خود پڑھ کر معلوم کیجئے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہیں کہ پھر "ادیب" کے عید نمبر کی جتنی جلدیں شائع ہوئی ہیں اُن کو تو منگا کر ہم اپنے صندوق میں بند کرلیں اور آپ لوگ صرف ہماری اس تنقید کو پڑھ کر بیٹھ جائیں۔

مگر لاحول ولا دیکھا آپ نے کہ ہم پھر کہاں سے کہاں پہنچ گئے، لکھنا تھا

آپ بھائیوں کو خیریت کا خط اور لکھ گئے جانے کیا! اماں کہنا یہ تھا کہ خدا اگر بیوی دے تو اسکول کی پڑھی ہوئی اور ایک ادیب کی بیوی کو جتنا ذی علم اور جتنا خوش ذوق ہونا چاہیئے اسے تو آپ خوب جانتے ہیں اور یہاں یہ حال ہے کہ عید نمبر کی تمام تصاویر پر تو نوچ لیں اپنے ننھے میاں کے تماشہ کے لئے اور اسکے ادھڑے اوراق لاکر رکھ دیئے ہماری میز پر، نتیجہ یہ ہوا کہ سر پکڑا منیجر صاحب "ادیب" کو لکھ دیا کہ بھائی دو جلدیں "ادیب" کے عید نمبر کی اور ہمارے نام وی پی کر دو تاکہ سند رہیں ہماری اُن کی جہالت کی، تو اس پر منیجر صاحب ادیب نے بکمال قدر دانی فوراً ہمارے نام مبلغ عہ۱ر کا پارسل بھیجدیا، اب دیکھیں اس پارسل کو ہم دام لے کر وصول کرتے ہیں یا ڈاکخانہ والے؟

تو بھائی معاف کیجئے گا، کہنا یہ تھا کہ آپ لوگ بہت یاد آتے ہیں اماں عید بقر عید پر تو مل لیا کرو، بچے بھی بہت یاد کرتے ہیں، باقی سب طرح خیریت ہے اور خیر و عافیت آپ سب کی درگاہ خداوندی سے شب و روز نیک چاہتے ہیں، اب آپ ہماری خیر و عافیت جس طرح چاہتے ہوں اسے "بوالیسی ہذا" لکھ دیجئے!

---

(۲۰)

ایڈیٹر صاحب اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے نام!

ایڈیٹر صاحب اخبار "الجمعیۃ" دہلی زاد لطفہٗ!

آپ یقین فرمائیں یا نہ فرمائیں کیونکہ وہ تو کہا ہے تاکہ "فیہا" یعنی یہ کہ دُنیا کا جس قسم کا بھی ملّا رموزی ہوگا وہ غریب دن بھر نوکری فرمائے گا تو لامحالہ وہ مضمون نگاری نہ کر سکیگا، اور جب وہ مضمون نگاری نہ فرما سکیگا تو پھر کسی کو کیا غرض کہ وہ اپنے قلم سے ایک عالم آرا مضمون لکھ کر اسے ملّا رموزی کے نام سے شائع کرادے! اس لئے یقین فرمائیے کہ ہم عرصہ دراز سے دن کی روشنی کو کچہری اور رات کی راحت بخش تاریکی کو اتوار کا دن سمجھتے ہیں، اس لئے اسوقت جو یہ خط آپ کو لکھ رہے ہیں تو ہماری دُو سال کی خرید کی ہوئی "ٹائم پیس" گھڑی میں رات کے مبلغ تین بجے ہیں، اور وہ جو ہمارے دروازہ کے سامنے مولوی عثمان صاحب مرحوم کا لگایا ہوا نیب کا درخت ہے، اس پر "طیوٗ صبح خواں" کے حیات پرور نغمے شروع ہو چکے، اور وہ آپ کی خادمہ پڑی پلنگ پر خراٹے لے رہی ہے، اب ذرا سوال کیجئے کہ ایسی وہ کونسی مصیبت تھی جو ہم

اس وقت یہ خط لکھنے بیٹھ گئے اور اپنے سوٹے کو طاق پر رکھ دیا؟

سو دیگر احوال یہ ہے کہ دُوسرے مضامین سے فارغ ہو کر ہم پلنگ پر لیٹ کر چند ضروری اخبارات کو ڈاکٹر ایس کے برمن کلکتہ والے کی نیند لانے والی گولیاں سمجھ کر جو پڑھتے ہیں تو ذرا جلد نیند آجاتی ہے، ورنہ بغیر اخبار پڑھے جاگتے جاگتے وہ وقت آجاتا ہے جب رات بھر کے آئے ہوئے گیدڑ شہر سے جنگل کی طرف واپس جاتے ہوئے صاف صاف نظر آنے لگتے ہیں، تو بس اخبارات میں ۱۱ جون ۱۹۳۰ء کا اخبار "الجمعیتہ" بھی تھا، اس کا صفحہ ۲ کیا دیکھا کہ دُنیا آنکھوں میں سیاہ ہو گئی، یہ پڑھ کر کہ حضرت محترم مولانا احمد سعید صاحب قبلہ پر بمبئی میں حملہ کیا گیا، حاشا کہ اس خیال سے صدمہ نہیں ہوا کہ یہ حملہ اپنے مولانا احمد سعید صاحب پر کیا گیا، کیونکہ ایسے ویسے حملوں کے لئے اللہ پاک نے اپنے مولانا صاحب کو بھی کوئی معمولی طاقت و توش تو دیا نہیں جو کوئی خطرہ ہو، یا اس لئے افسوس نہیں ہوا کہ حملہ کرنے والے بمبئی کے غنڈے تھے، دہلی کے کیوں نہ ہوئے، بلکہ جس خیال نے نیند حرام کر دی اور دُنیا تاریک نظر آئی وہ یہ تھا کہ ایک ایسی شخصیت پر حملہ کیا گیا جو خدائے عرش و فرش کے اس اشرف کائنات نبیؐ کا نائب اور امانت دار ہے جس کے غلاموں کے لئے کائنات

عالم کی تمام سربلندیاں سجدہ ریز و سرنگوں نظر آتی ہوں، پھر حملہ کرنے والے بھی کون ہوں کہ مسلمان! فیا ویلنا ویا حسرتا۔

حضرت مولانا احمد سعید صاحب کی عظمت و برگزیدگی اس لحاظ سے کیا کم ہو سکتی ہے کہ وہ اُن علوم و رموز کے ماہر ہیں جو براہ راست ورثہ کہے جاتے ہیں امام الاتقیا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، لیکن جب اس سعادت و برگزیدگی پر حضرت مولانا کے نام کے ساتھ لفظ "ناظم جمعیۃ العلماء" بھی لکھا جائے، تو ان کی عظمت کے احترام پر اگر ملا رموزی کے ماں باپ بھی فدا ہو جائیں تو یہ فدیہ براہ راست نبیٔ گرامی جاہ علیہ السلام کے لئے ہو گا، نہ حضرت مولانا احمد سعید کے لئے،

تو پھر کیا آج ملا رموزی کو اپنا قلم ہمیشہ کے لئے یہ کہکر توڑ دینا چاہئے کہ مسلمانوں میں اب مسلمان کہلانے کی صلاحیت نہیں رہی، پھر وہ کس قوم کی خدمت کے لئے اپنے قلم سے کام لے؟

سہی کہ حضرت مولانا کے اعمال و افکار سے بعض مسلمانوں کو پہاڑوں کے برابر اختلاف ہے، لیکن وہ اس پر بھی اس کمینگی اور اس سفلہ پن کے مستحق تو نہیں تھے، جو بمبئی میں اُن کے ساتھ روا رکھا گیا، پھر وہ بمبئی جو "باب المکہ"

بھی کہلاتی ہے، اور باب الہند بھی، جہاں کی اسلامی عبادت گاہیں سارے ہندوستان کی اسلامی عبادت گاہوں سے زیادہ کثیر، حسین اور آباد، جہاں اسلامیان ہند کی قابل صد احترام تحریک خلافت کا مرکز ہے، جہاں حجاج اور زائرین بیت الحرام کی راہ میں آنکھیں بچھانے والوں کی تعداد ناقابل احاطہ ہے، مگر اس حادثہ نے ان چیزوں کی عظمت تو کم نہیں کر دی، البتہ بمبئی کے نام پر ایک ایسا تاریخی داغ آ گیا جسے صحیح معنی کی تاریخ اسلام کبھی معاف نہیں کر سکتی، لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ تاریخ اسلام ایسے گھناؤنے واقعات اور ایسے اشرار سے کبھی خالی نہیں رہی ہے، خود امام الہدیٰ صدر دیوان حشرؐ کے بابرکت عہد میں وہ مکہ شریف کے مشہور اعلیٰ حضرت بھیا ابوجہل موجود ہی تھے!

اب سوال یہ ہے کہ اختلافِ افکار و اختلافِ عمل کی کیا یہ ایک صورت کارآمد بھی ہو سکتی ہے،؟ اور اگر خدا نہ کردہ اس صورت سے کوئی کامیابی حاصل ہو بھی جائے تو کیا ایسے محرکین خدا و رسولؐ اور عالم اسلام کی نظر میں کوئی وقعت بھی پا سکتے ہیں؟ اور جو انہوں نے اپنے خیال میں ایسے اعمال کا کوئی اجر و نتیجہ قرار دے ہی لیا ہے، تو پھر اے اخبار "الجمعیتہ" کے ایڈیٹر صاحب لائیے اور آپ ان لوگوں کے نام بقید ولدیت و قومیت و سکونت ملا رموزی کو بتا دیجئے، جنہوں نے ناموس شریعت حملہ کو بھی

ثواب اور کارِ خیر قرار دیا ہے، تاکہ ملّا رموزی کا قلم بھی ان کے مقابل وہ کچھ لکھتا رہے جو اس نے آج تک نہ یزید کے لئے لکھا ہو نہ ابو جہل کے لئے، کہ ملّا رموزی بھی ایسوں کے خلاف لکھنے کو دارین کی سعادت سمجھتا ہے، خواہ یہ ملّا رموزی کی لیاقت سمجھی جائے یا حماقت!

مگر ہاں صاحب وہ خوب یاد آئی یا یاد آیا کہ اس کمینہ حملہ کے بعد حضرت قبلہ مولانا نے تو اسی عفو مصطفوی اور ضبط و بُردباری سے کام لیا جس کی اُن کے علم و منصب سے توقع تھی، مگر وہ آخر کو شہر بمبئی کی پولیس بھی تو مسلمان ہے تو آخر اُس نے ان غنڈوں کا تعاقب کس نمبر کی موٹر کار پر سوار ہو کر کیا؟ براہ کرم اس موٹر کے نمبر بھی ہمیں بتا دیجئے، کیونکہ اس وقت تک فقط ان صاحبِ ایمان و استقلال حضرات کا تذکرہ ہوا ہے جنہوں نے شریعت اسلامیہ کے اس جلیل القدر حامل کو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بچایا ہے، جس سے ان کے مدارج و مراتب خدا و رسول کے نزدیک کہیں بلند و برتر ہو چکے، اب تو اس عفو و درگذر اور ضبط و صبر پر حضرت مولانا قبلہ کی خدمت میں ہدیۂ شکر و مبارکباد پیش کرنا ہے، اور ان غنڈوں کی تحقیق، اور مان لیجئے کہ یہ غنڈے ہرگز ہرگز بمبئی کے نہیں ہوں گے، پھر بیچارے بمبئی والوں کو مفت میں کچھ کہنا غلط ہے، اگر آپ سے ہو سکے تو شہر بھر کر ذرا اُن کا

پتہ چلا لیجئے، اور ہاں وہ خوب یاد آئی کہ یہ معاملہ ہمیں راز کے لفافہ میں لکھ کر روانہ کیجئے گا، ورنہ جناب پھر آپ سمجھتے ہی ہیں زیادہ کہنے کی کیا ضرورت؟ اور بھئی کہدینا کہ مولانا صاحب آپ کو بچے بہت بہت اور درجہ بدرجہ سلام کہتے ہیں،

---

(۲۱)

ایڈیٹر صاحب اخبار "الخلیل" دہلی کے نام

جناب گرامی ایڈیٹر صاحب اخبار "الخلیل" دہلی!

بعد سلام مسنون کے معلوم ہو کہ یہاں پر بفضل خدا ہر طرح خیریت ہے، فقط بارش کیوجہ سے ہمارا مکان دس پانچ جگہ سے گر گیا ہے، مگر ہاں مکان کے گر جانے کو خیریت اور خیر و عافیت سے کیا تعلق، بس تو پھر آپ یہی سمجھ لیجئے کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے، البتہ آپ کی خادمہ آجکل ذرا مضمحل سی رہتی ہے جو موسم کی خرابی کا اثر ہے، مگر ہاں اس کو بھی ہماری خیریت اور خیر و عافیت سے کیا تعلق، اس لئے اس کے بعد بھی آپ یہی سمجھے رہئے کہ یہاں ہر طرح خیریت ہے،

اس لئے دیگر احوال یہ ہے کہ بس وہ کوئی تین ہفتے پہلے تو آپ کا خط آیا تھا جو اس خبر پر مشتمل تھا یا خبر اس پر مشتمل تھی کہ اخبار "الخلیل" انشاء اللہ جلد سے جلد روانہ

ہونیوالا ہے، صاحب کیا عرض کریں کہ کس قدر خوشی ہوئی اور وہ آپ کی خادمہ تو اس خبر سے بہت اور "نہایت بہت" خوش ہوئی، کیونکہ اس اللہ کی بندی کو یہ خیال ہوا کہ "الخلیل" اگر روزانہ ہوگیا تو تصاویر بھی روزانہ دیکھنے میں آئیں گی اور وہ تصاویر بھی کیسی کہ جن کے اندر فیشن کی باتیں دکھائی جاتی ہیں، تو بس اس سے اندازہ فرما لیجئے ہماری "ان" کے ذوق کا۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ ایک ہماری ہی "وہ" کیا آجکل یہ جتنی اسکول یافتہ ہوتی ہیں اُن میں سے ہر ایک کو اگر کوئی شوق ہے تو بس "فیشن کی چیزوں کا" اور یہ دیکھتے نہیں ہیں آپ کہ آجکل کے اسکول اور کالج میں پڑھنے والے سفید سفید رنگ کے لونڈے بھی تو فیشن کی ایسی چیزیں پہنے پھرتے ہیں جن کی وجہ سے وہ نیلم پری اور جانکی بائی الہ آباد والی معلوم ہوتے ہیں، اور یہ جو آجکل ہر شریف آدمی آپکا ہمارا قرضدار بنا ہوا ہے وہ ایسی ہی عورتوں اور لونڈوں کے طفیل، تو خیر جانے دیجئے انھیں چولھے اور بھاڑ میں، کیونکہ وہ ہم اصل بات کو لکھنا ہی بھولے جاتے ہیں، اس لئے آپ تو یوں سمجھئے کہ:۔

دیگر احوال یہ ہے کہ ۲۴۔ جولائی ۱۹۳۰ء کا اخبار "الخلیل" آیا تو کیا خود ہی ڈاکخانہ سے جا کر لائے، بس صاحب کیا دیکھتے ہیں کہ صفحے اپر ایک نہایت اور "بہت ہی نہایت عمدہ" مضمون ہے کہ چھپا ہوا ہے اور اسکی سطروں میں ایک جگہ

صاف صاف یہ لکھا ہوا ہے کہ "ملّا رموزی صاحب بد مذاق اخبار دیکھنے والوں اور بد مذاق خریدنے والوں کے خلاف کچھ نہیں لکھتے، بلکہ وہ ایڈیٹروں کے خلاف ہی اُلٹا لکھتے ہیں"، اور وہاں یہ لکھا تھا کہ "ملّا صاحب کو ہم ایک اچھا سیاسی آدمی سمجھتے ہیں"۔ بس جناب اس عبارت کو پڑھنا تھا کہ اپنی سیاسی زندگی اور سیاسی ذوق کی بربادی پر آنکھوں سے آنسو جاری ہونے والے ہی تھے کہ معاً "اُن" کا خیال آگیا اور ہم نے کہا کہ اگر ملّا صاحب آپ نے اپنی سیاسی زندگی کو یاد کر کے ایک آنسو بھی گرایا تو یہ خیال کرینگی کہ ہو نہ ہو اس بارش میں گرنیوالے مکان کی دوبارہ تعمیر کی فکر سے رو رہے ہیں، مگر جناب ہوتا کیا ہے، دل تو بیکار سا ہو گیا اور لکھنے والے کے حق میں دل سے دعا نکلی، جس نے ہماری تحریروں سے ہمارے صحیح ذوق کا اتنا صحیح اندازہ تو کر لیا، ورنہ جناب آجکل کے اخبار اور رسالے پڑھنے والے اوّل تو یہی نہیں سمجھتے کہ وہ اخبار پڑھ رہے ہیں یا کسی آدمی کو پڑھ رہے ہیں!

بس اگر وہ پڑھتے ہیں تو یہ کہ پشاور میں کتنے آدمی گرفتار ہوئے، ظفر علیخاں کے خلاف کوئی مضمون ہے یا نہیں، ملّا رموزی نے کوئی ہنسانے والی بات لکھی ہے یا نہیں، "الخلیل" میں کوئی برہنہ تصویر بھی ہے یا نہیں، یا اس میں کوئی ایسا

فسانہ بھی شائع ہوا ہے جس میں کسی حسینہ کو لے بھاگنے کا طریقہ بتایا گیا ہو، اور جو کچھ بہت ہی زیادہ لیاقت سے پڑھا تو یہ سمجھے کہ ہندوستانی برطانیہ سے ہندوستان کو سو برس میں بھی آزاد نہیں کرا سکتے"، اور دیکھ لینا کہ کل پرسوں تک سارے ہندوستان میں ہندو راج ہو جائیگا، یا مسلمان راج، اور جو اس سے بلند قابلیت سے اُردو کے اخبار کو پڑھا تو بس یہ نتیجہ نکالا کہ لیجئے یہ فلاں خبر اس اخبار میں آج شائع ہوئی ہے، حالانکہ "پانیر" میں یہ خبریں پرسوں ہی پڑھ چکا تھا، گویا "پانیر" اخبار ایک طرح کا عامل کریم الدین عملیاتی لاہوری ہے، جن کے دفتر میں ملاقات سے آنے والی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں،

مگر خیر صاحب ہمیں ان باتوں سے کیا کام، کہنا تو یہ ہے کہ ہمارے محترم "پنجاہ سالہ مضمون نگار" سے آپ بعد سلام مسنون آنکہ ہماری جانب سے بہت زیادہ جھک جھک کر یہ کہدیجئے گا کہ آپکے ارشاد کے موافق ہم انشاء اللہ خریداران اخبارات اُردو کے خلاف نہایت زناٹے کے ساتھ ایک مضمون رسالہ عالمگیر لاہور کے "ستمبر نمبر" میں لکھ دینگے آپ پڑھ لینا اور خدا کی ذات سے توقع ہے کہ یہ اس قدر زور دار اور بے باک مضمون ہو گا کہ پھر یا تو اُردو اخباروں کے خریدار آپ کی مرضی کے موافق اُردو کے اخباروں کی قدر پہچانیں گے یا پھر

مارے شرم وحیا کے جس کنوئیں اور دریا میں گورنمنٹ اجازت دیدے گی ڈوب مریں گے، مگر عزت دار ہونگے تو پھر زندہ نہ رہیں گے اور اگر گھر میں ہماری "ان" کے درمیان چل نہ گئی یا "چھڑ نہ گئی" تو انشاء اللہ اسی کیساتھ اُردو زبان کے "ایڈیٹروں" پر بھی ایک مضمون لکھ دینگے، جس سے ان بیچاروں کی مشکلات کا گورنمنٹ کو بھی علم ہو جائیگا، بس افسوس یہ رہیگا کہ جمعیۃ الاقوام کو یہ مضمون نہ پہنچا سکیں گے، جس سے وہ بھی سمجھ لے کہ دیسی اخباروں کا دیگر احوال کیا ہوتا ہے، کیونکہ سنا یہ ہے کہ جمعیۃ الاقوام یہاں سے کئی ماہ کے فاصلہ پر رہتی ہے اور روزانہ کسی سے ملتی بھی نہیں،

بس یا تو وہ ملتی ہے ملک شام سے، سو وہ بھی حکومت فرانس کے ذریعہ، یا پھر وہ ملتی ہے حکومت جرمنی کے تاوان جنگ سے، سو وہ بھی اتحادی حکومتوں کی معرفت! یہ نہیں کہ آپ صبح بھی اس سے جا کر مل آئیں اور شام کو بھی اسی کے ساتھ چائے پینے بیٹھ جائیں،

اس لئے امید ہے کہ ہمارے پنجاہ سالہ مضمون نگار بھائی اب ہم سے خوش ہو جائیں گے اور ہمارے مکان کی از سر نو تعمیر کے حق میں دعا فرمائیں گے،

اب رہا یہ سوال کہ ہم نے یہ آدھا خط کیوں لکھا ہے، سو اس کا سبب

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم آجکل اپنی تازہ ترین کتاب "عورت ذات" کے چھپوانے اور فروخت کرنے کے معاملات میں پھنسے ہوں گے، یا یہ کہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کے لئے لوگوں کی خوشامد کرتے پھرتے ہونگے، یا دو چار مزدوروں کے ساتھ اپنا مکان بنواتے ہوں گے، اس طرح کہ خود بھی پتھر اور مٹی اٹھا کر مزدور کو دیتے جاتے ہوں گے اور راہ گیروں کی نظر بچا کر ایک آدھ پتھر خود بھی جما دیتے ہوں گے، یا پھر خرچ کی زیادتی پر غور کرتے کرتے سو جاتے ہونگے، یا اپنی "اُن" سے اس معاملہ کا کوئی جھگڑا مول لے لیتے ہونگے، جس کے تصفیہ سے تین دن فرصت ہی نہ ملے، یا پھر ان تمام افکار سے تنگ آکر ادھر اُدھر تفریح کرتے پھرتے ہوں گے، کہ ایسے ہی حالات تو ہوا کرتے ہیں آپ کی اُردو کے مضمون نگاروں کے، اب یہ آپ کی قابلیت ہے کہ ہمارے اس آدھے خط کا سبب جس چیز کو چاہیں بنالیں!